غالب نامہ

ارمغانِ غالب

حصۂ نظم

اکرام

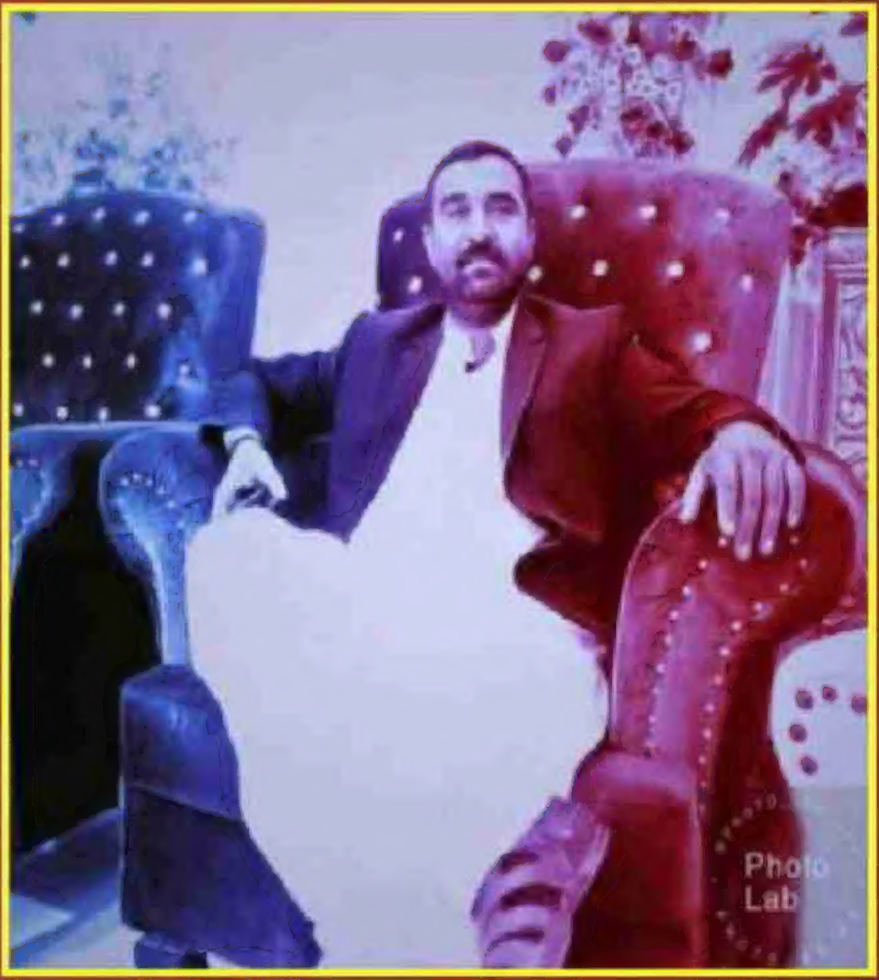

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

ارمغانِ غالب

مرزا غالب کے اردو اور فارسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب
تاریخی ترتیب سے

از

شیخ محمد اکرام - ایم - اے - آئی - سی - ایس مؤلف غالب نامہ

ناشر
تاج آفس - محمد علی روڈ بمبئی

(ذخیرۂ [illegible])

مرکنٹائل پریس لاہور میں شیخ محمد اقبال ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر
تاج آفس، محمد علی روڈ بمبئی سے شائع کیا

ز۔ اے کے نام

درِ عشق غنچہ ایم، کہ لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم

م

فہرست

شمار					صفحہ
۱	ریختہ	۱۸۰۷ء (؟)	تا	۱۸۲۱ء	۲۵
۲	نغمانۂ شباب	۱۸۲۱ء	تا	۱۸۲۷ء	۱۰۵
۳	بہارِ عجم	۱۸۲۷ء	تا	۱۸۴۷ء	۱۴۳
۴	نوائے ظفر	۱۸۴۷ء	تا	۱۸۵۷ء	۲۳۷
۵	چراغِ سحری	۱۸۵۷ء	تا	۱۸۶۹ء	۲۹۹

دیباچہ

آج سے کوئی آٹھ سال پہلے ہم نے غالب نامہ میں منتخب کلامِ غالب کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا تھا۔ کتاب کی دوسری اشاعت ۱۹۳۹ء میں بعض اصلاحیں ہوئیں۔ اور اب مزید ترمیم کے بعد یہ انتخاب، طویل مقدمہ کے بغیر، ناظرین کے پیشِ خدمت ہو رہا ہے۔

موجودہ تدوین میں غالب نامہ کے دوسرے ایڈیشن سے اس لحاظ سے اختلاف ہے کہ چند نئی اردو اور فارسی غزلوں کے اضافہ کے علاوہ، ان بیس سالوں کا اردو کلام بھی، جب مرزا کی اصل توجہ فارسی کی طرف تھی، تین جزوی ادوار میں منقسم کر دیا ہے۔ اور اسے باقی کلام سے علیحدہ ترتیب دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک دور کے متعلق رام پور کے اس قلمی دیوان سے مدد ملی ہے۔ جس کے شروع میں دیباچہ، مورخہ ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۸ھ درج ہے۔ اور جس کی بنا پر ہم نے ۱۸۲۷ء کے بعد اور ۱۸۳۲ء سے پہلے کے اردو اشعار کو علیحدہ ترتیب دیا ہے۔ اس قلمی دیوان سے ہم مولوی امتیاز علی عرشی کی عنایت سے مستفید ہوئے۔ جنہوں نے ہمیں اس کا پتہ دیا۔ اور اس کے اندراجات کا خلاصہ ارسال کیا۔

اس کے علاوہ غالب نامہ کے دوسرے ایڈیشن میں جو غلطیاں کاتب کی بے احتیاطی سے راہ پا گئی تھیں۔ ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ اور شاید موجودہ ترتیب پہلی دو اشاعتوں سے ہر طرح زیادہ صحیح اور مکمل نظر آئے۔

جن اصولوں اور جن مآخذ کی بنا پر یہ انتخاب مدون ہوا انکی تفصیل شروع میں درج کر دی گئی ہے

ارمغانِ غالب کی کتابت کے لئے ہم نے ایک کاتب (امر آدر قم) کو، جو پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل تھا، خاص طور پر لاہور سے بلایا تھا۔ اور کتابت اپنی نگرانی میں کرائی۔ لیکن ابھی کاپی کی پورے

طور پر اصلاح نہ ہوئی تھی۔ کہ اسے لاہور واپس جانا پڑا۔ اور کاپی کی تصحیح کا مزید کام ہمارے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر سیّد عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ لیکچرر پنجاب یونیورسٹی کی نگرانی میں ہُوا۔

ارمغانِ غالب کی کتابت ہو رہی تھی۔ کہ رام پور سے غالب کا اپنا مرتب کردہ انتخاب شائع ہُوا۔ ریاست رام پور نے جس شاہانہ اہتمام سے غالب کی بعض تصنیفات اور تبرکات کو شائع کیا ہے۔ اور مولوی امتیاز علی عرشی نے جس نفاست و صحت کے ساتھ اس کام کی تکمیل کی ہے۔ وہ مستحق صد داد و آفریں ہے۔ انتخابِ غالب کو دیکھنے کے بعد کچھ عرصہ تو ہم متامل رہے۔ کہ ارمغان بلکہ غالب نامے کی اشاعت کا ایک بڑا مقصد غالب کے فارسی کلام کو ایک منتخب اور خوش آیند صورت میں پیش کرنا تھا۔ اب جبکہ خود شاعر کا مرتب کردہ انتخاب بازار میں آگیا ہے۔ شاید ارمغان کی اشاعت جرأتِ مذمومہ سمجھی جائے لیکن پھر خیال آیا۔ کہ اگرچہ شاعر کے اپنے انتخاب میں جو بات ہے۔ وہ کسی اور کے انتخاب میں نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی ارمغان میں کلام تاریخی ترتیب سے درج ہے۔ اور انتخاب میں ردیف کی رعایت سے۔ اس کے علاوہ مرزا نے اُردو انتخاب مرتب کرتے وقت منتخب دیوان کے باہر کے سب اشعار اور فارسی انتخاب کے وقت غزلیات اور رُباعیات کے سوا باقی سب کلام کو (جو قدر و قیمت اور حجم میں غزلیات و رباعیات سے کم نہیں) نظر انداز کر دیا ہے اس لئے شاید اسکے بعد بھی ایک زیادہ مکمل انتخاب کی ضرورت باقی رہے۔

اس کے علاوہ اگرچہ اپنے کلام کے انتخاب کا جو حق خُود شاعر کو ہے، وہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی "پسند اپنی اپنی"۔ اور کیا یہ مرزا کا اپنا ارشاد نہیں۔ کہ (پسند شعر کی وادی میں بھی) ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے!

اکرام

کلامِ غالب کی تاریخی تدوین

دیوانِ غالب کی تاریخی تدوین میں سب سے پہلا قدم مفتی انوار الحق نے اُٹھایا۔ جنہوں نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے وقت غالب کے وہ اشعار جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے تھے۔ بعد کے اشعار سے جُدا کر کے ترتیب دیئے۔ مفتی صاحب نے یہ ترتیب صحیح عالمانہ ذوق سے متاثر ہو کر کی ہے لیکن اس التزام میں انہیں بہت پیچیدگیاں پیش نہیں آئیں۔ دیوان کے مرتب کرتے وقت ان کے پیشِ نظر دیوانِ غالب کا ایک ایسا قلمی نسخہ تھا۔ جس پر تاریخ کتابت ۱۲۳۷ھ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ جو اشعار اس نسخے میں موجود تھے۔ وہ تاریخ کتابت سے پہلے ہی لکھے گئے تھے۔ اور چونکہ شاعر کی عمر اس وقت پچیس برس کی تھی۔ اس لئے جو اشعار اس نسخے کے متن میں درج تھے۔ وہ اس عمر تک لکھے جا چکے ہوں گے۔ مفتی صاحب نے یہ نسخہ کسی قدر احتیاط سے مرتب کیا[1]۔ لیکن پھر بھی اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ

---

[1] کتابت کی غلطیاں اس میں بے شمار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک قلمی نسخے کے بعد کی غزلوں کا تعلق ہے۔ یہ نسخہ نظامی پریس کے شائع کردہ دیوانِ غالب (مطبوعہ ۱۹۱۷ء) کی

(باقی اگلے صفحے پر۔)

مطبوعہ کتاب ہُوبہُو قلمی نسخے کے مطابق ہے ۔ مثلاً نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ ۱۵ پر ایک غزل ہے

؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

مفتی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ غزل قلمی نسخے میں درج ہے ۔ لیکن مطبوعہ کتاب میں انہوں نے قلمی نسخے کے جس صفحے کا عکس چھاپا ہے ۔ اس کے حاشیے پر یہ غزل موجود ہے ۔ اسی طرح مندرجہ ذیل غزلیں بھی قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہیں ۔ لیکن مطبوعہ کتاب میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا؟   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا؟

پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۹)
نقل ہے ۔ نظامی پریس والوں نے تو اس ایڈیشن کے آخر میں غلط نامے کا اضافہ کر دیا ۔ اور بعد کے ایڈیشنوں کو بڑی احتیاط سے مرتب کیا ۔ لیکن نسخۂ حمیدیہ نقل کرتے وقت غلط نامہ نظر انداز کر دیا گیا ۔ اور غلطیاں ساری نقل کر لی گئیں ۔ قلمی نسخے کی غزلیں بھی مطبوعہ ایڈیشن میں اصل کے مطابق نہیں ۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی

مفتی انورالحق کے بعد دیوانِ غالب کی ترتیب کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ڈاکٹر سید عبداللطیف نے کی۔ اُن کا مرتبہ دیوانِ غالب ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ ۱۹۲۸ء میں اس کی اشاعت کے وعدے ہوئے تھے۔ لیکن جن اصولوں پر وہ اُسے مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تشریح انہوں نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں کر دی ہے۔ اس کے مطابق انہوں نے غالب کے اُردو کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ دورِ اوّل ۱۸۱۱ء - ۱۸۲۱ء
۲۔ دورِ ثانی ۱۸۲۲ء - ۱۸۳۲ء
۳۔ دورِ ثالث ۱۸۳۲ء - ۱۸۵۵ء
۴۔ دورِ رابع ۱۸۵۶ء - ۱۸۶۹ء

بظاہر تو یہ ترتیب نہایت معقول ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ اگر شاعر کے کلام کو ان چار بڑے حصوں میں ترتیب دے کر مطالعہ کیا جائے تو اس کی ذہنی نشو و نما کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس تاریخی ترتیب کا ذریعہ بھوپالی نسخے کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ بیشک اس نسخے کے حاشیے کے اشعار کو انہوں نے ترتیب دے کر ہماری واقفیت میں اضافہ کیا ہے لیکن اس بارے میں بھی ان کی یہ رائے غلط ہے۔ کہ جو اشعار قلمی نسخے کے متن یا حاشیے میں درج نہیں وہ سب ۱۸۳۲ء کے بعد کے ہیں۔ نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے گلشن بے خار ۱۸۳۲ء میں لکھی۔ اس میں انہوں نے غالب کے اُردو دیوان کا انتخاب دیا ہے۔ اور کئی ایسی

غزلوں کے اشعار درج کئے ہیں۔ جو بھوپالی نسخے کے حاشیے پر تو موجود نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر وہ ۱۸۳۲ء سے بعد کی ہوتیں تو ان کا انتخاب شیفتہ اپنے تذکرے میں نہ کر سکتے۔ اسی طرح "چکنی ڈلی" کی تعریف میں مرزا کا جو قطعہ ہے۔ وہ قیامِ کلکتہ کے دوران میں یعنی ۱۸۳۲ء سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن قلمی نسخے کے حاشیے پر اُس کا کوئی اندراج نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ جو اشعار نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے پر درج ہیں۔ وہ ۱۸۳۲ء سے پہلے کے بلکہ ہماری تحقیق کے مطابق ۱۸۲۷ء سے بھی پہلے کے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا۔ کہ قلمی نسخہ ۱۸۳۲ء تک کے تمام اشعار کی مکمل یادداشت ہے۔ اور جو اشعار اس میں نہیں وہ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۵ء تک یعنی تیسرے دَور کے شمار کئے جانے چاہئیں +

ڈاکٹر صاحب کی کتاب کلامِ غالب کو کسی علمی اصُول کے تحت مرتب کرنے کی پہلی ٹھوس کوشش ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی شاعر کے کلام کو تاریخی ترتیب سے مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو جس قدر تنقید اور ریسرچ کے عام اصولوں سے واقفیت ہے اُتنی غالب کی تصنیفات سے نہیں۔ اور اپنی کتاب میں انہوں نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں جو غلط ہیں۔ اِن غلطیوں نے ان کی کتاب کی علمی وقعت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۲ پر وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔ "وہ ۱۸۵۷ء کے غدر تک مہرِ نیمروز لکھنے میں مشغول رہا۔" حالانکہ مرزا یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں ختم کر چکے تھے۔ وہ ۱۱ر جون ۱۸۵۲ء کے ایک فارسی خط میں منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھتے ہیں۔ "مسودہ روزنامہ رُودادِ اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدست ہیرا سنگھ رواں داشتہ ام۔ و ہنوز از رسیدنش نشاں نیافتہ ام۔" انہوں نے مولوی رجب علی خان کو ایک خط مارچ ۱۸۵۲ء کے بعد لکھا۔ اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے۔ "بعد حمد و نعت و منقبت و مدحِ والیٔ عصر و سبب

تالیف کتاب کہ آئین نامہ طرازانِ ہنگامہ آراست۔ از کشور کشایاں تا نصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ام۔ باقی فرداست" چونکہ مرزا نے ہمایوں کے بعد کے حالات لکھے ہی نہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مہرِ نیمروز سنہ ۱۸۵۲ء تک مکمل ہو گئی ہو گی۔ علاوہ ازیں نواب ضیاءالدین کی تاریخ طباعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سنہ ۱۸۵۵ء میں یہ کتاب چھپ بھی گئی تھی اور اس کا سنہ ۱۸۵۵ء کا چھپا ہوا ایک نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے +

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ سنہ ۱۸۵۹ء کے بعد کی اہم تصنیف مرزا کی فارسی مثنوی "ابرِ گہر بار" ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سر سیّد نے سنہ ۱۸۴۵ء میں "آثار الصنادید" لکھی تو مثنوی لکھی جا چکی تھی۔ چنانچہ سر سیّد لکھتے ہیں "...... اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات..... کے اگرچہ ہنوز ناتمام ہے۔ لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔" علاوہ ازیں اس مثنوی کے کئی اشعار "مہرِ نیمروز" میں منتخب ہوئے ہیں +

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ غالب کا اردو دیوان سنہ ۱۸۵۵ء کے قریب منتخب ہوا۔ لیکن مولوی کریم الدین نے سنہ ۱۸۴۶ء میں جو "تذکرۃ الشعرائے اردو" دہلی سے شائع کیا۔ اسمیں وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔ "..... اور ایک دیوان اردو اُن کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے مطبع سید الاخبار میں درمیان سنہ ۱۸۴۳(۹)ء[ل] کے چھپا تھا...... وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے۔" اسی ضمن میں انہوں نے انتخاب کے متعلق بھی ذکر کیا ہے۔ کہ مرزا نے ایک ضخیم دیوان کو "منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان بنا لیا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ دیوان جو بقول مولوی کریم الدین سنہ ۱۸۴۳(۹)ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس سے پہلے منتخب ہوا ہو گا۔ اسکے علاوہ

[ل] تذکرۃ الشعراء کا جو نسخہ ہمیں ملا ہے۔ اس میں سن کا پہلا ہندسہ ٹھیک طرح پڑھا نہیں جاتا +

مرزا کی فارسی نظم و نثر کا ایک بیش قیمت مجموعہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔ جس کی تاریخ کتابت لائبریری کی مطبوعہ فہرست میں تو سنہ ۱۱۵۴ء ہجری درج ہے۔ لیکن جو یقیناً سنہ ۱۲۵۴ھ یعنی سنہ ۱۸۳۸ء میں نقل ہوا۔ اس میں بھی دیوانِ ریختہ کا فارسی دیباچہ موجود ہے۔ ہمارے خیال میں اس زبردست شہادت کی بنا پر یہ یقین کرنا خطرے سے خالی ہوگا۔ کہ مرزا کا پہلا اُردو دیوان پچیس ۲۵ برس کی عمر سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا۔ اور اس کے چند سال بعد انہوں نے اس میں سے مشکل اور کم پایہ اشعار نکال کر منتخب دیوان ریختہ مرتب کر لیا تھا۔ اُس کے بعد انہوں نے بیشتر فارسی شعر کہے ہیں۔ اُردو اشعار بہت کم۔ اُن کا پہلا اُردو دیوان اکتوبر سنہ ۱۸۴۱ء میں مطبع سید الاخبار سے شائع ہوا۔ اس مطبوعہ نسخے کی ایک نقل سید ابو محمد صاحب کے پاس اور دوسری پبلک لائبریری رامپور میں ہے۔ دیوان کا دوسرا ایڈیشن تھوڑے سے اضافے کے بعد مئی سنہ ۱۸۴۷ء میں مطبع دار السلام دہلی سے شائع ہوا جس کی نقلیں کئی حضرات[1] کے پاس ہیں۔ اس کے بعد دربار کے تعلقات کی وجہ سے مرزا کو اُردو کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑی۔ اور بالآخر سنہ ۱۸۵۷ء میں جب انہوں نے نواب رامپور کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ تو اس کے ساتھ اُنہوں نے اپنے اس زمانے کے کہے ہوئے اُردو کلام کا مجموعہ بھیجا۔ یہ مجموعۂ متداول دیوان کی بنیاد ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ یہ کلامِ غالب کا پہلا انتخاب نہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مرزا کی فارسی تصنیفات کو بہت اہمیت نہیں دی۔ اُنہوں نے غالب کے اُردو کلام کو چار دوروں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن فارسی کلام کو بالکل بالائے طاق رکھا ہے۔ ایک شاعر کے کلام کی تاریخی تدوین کا سب سے

---

[1] مثلاً مولانا حسرت موہانی۔ پیرزادہ ابراہیم حنیف مرتب "درس غالب" لاہور۔ مسٹر انور علی انور دی

بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس سے شاعر کی طبعی نشو و نما اور اس کی ذہنی تربیت کا حال معلوم ہوتا ہے اور خیالات کا تغیر و تبدل دکھانے سے شاعر کی شخصیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اب مرزا کی ذہنی حالت اور ان کے خیالات کا اظہار فقط انکے اُردو کلام میں نہیں۔ بلکہ فارسی زبان میں بھی انہوں نے شعر کہے ہیں۔ جو تعداد میں اُردو سے کہیں زیادہ ہیں اسکے علاوہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے بھی مرزا کا فارسی کلام اُردو دیوان سے کم رُتبہ نہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

نیست نقصاں یکدو جزو است ار سوادِ ریختہ
کاں دژم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ منست
فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ منست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگِ منست
کے درخشد جوہرِ آئینہ ؛ باقی است زنگ
صیقلِ آئینہ ام ایں جوہرِ آں زنگ منست

اور یہ بھی صحیح ہے کہ مرزا کے اُردو دیوان میں یا تو اُن کا طفولیت اور عنفوانِ شباب کے چند سالوں کا کلام ہے یا درباری دور کے اشعار ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ فرمائش کے طور پر لکھا گیا۔ اب اگر اس کلام کو مرزا کا حاصلِ زندگی سمجھ لیا جائے تو اس سے غالب کی ذہنیت یا اس کے کمالِ شعر گوئی کے متعلق جو نتائج اخذ ہوں گے وہ غیر مکمل مواد پر مبنی اور غلط ہوں گے +

اس اصولی نقص کے علاوہ فارسی سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے تصنیفاتِ غالب کی تعیین میں کئی غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی خط کی تاریخِ تحریر اس کے مضمون سے معین ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۴۰ پر اسے واضح کرنے کے لئے جو مثال دی ہے وہ خود غلط ہے وہ مرزا کے دو خطوط کا ذکر کرتے ہوئے جو ۱۸۶۱ء کے ہیں۔ اور جن میں غالب کے اردو دیوان کا ذکر ہے لکھتے ہیں۔ "اسی طرح نواب ضیاء الدین خان کے نام کا وہ خط بھی جو بلا تاریخ ہے (اور جس کا اقتباس درجِ ذیل ہے) اسی سال سے منسوب ہونا چاہیئے:۔

> جناب قبلہ و کعبہ، آپ کو دیوان دینے میں کیوں تامل ہے ۔ ۔ ۔ ۔
>
> ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں۔ تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گذرے"۔

اس خط کی تاریخ معین کرنا مشکل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ خط اردو دیوان کے متعلق نہیں۔ جو ۱۸۶۱ء میں مبرڑھ گیا۔ بلکہ فارسی کلیات کے متعلق ہے۔ کیونکہ نہ تو اردو دیوان میں نواب ضیاء الدین کی "تعریف کا قصیدہ" ہے اور نہ اُن کے "بھائی" (نواب امین الدین) کی تعریف کی نثر" یہ دونوں چیزیں فارسی کلیات میں ہیں۔ اور یہ خط کلیاتِ فارسی ہی کے متعلق ہے"۔

کلامِ غالب کی تاریخی تدوین کا خیال ہمیں ڈاکٹر لطیف کی کتاب پڑھ کر ہوا۔ اسکے بعد جب ہم نے غالب کے فارسی خطوط کا بغور مطالعہ کیا اور دیکھا کہ غالب نے ایک طویل حصہ عمر میں اردو شعرگوئی ترک کر رکھی تھی تو غالب کی شاعرانہ نشوونما سمجھنے کے لئے اس تدوین کی ضرورت ہمیں اور بھی محسوس ہوئی۔ شروع شروع میں ہم نے تاریخی تدوین کی بنا

نسخۂ حمیدیہ، قلمی نسخہ رامپور کے علاوہ معاصرانہ تذکروں پر رکھی۔ اور گلشنِ بے خار۔ آثار الصنادید، جلوۂ خضر اور دوسرے تذکروں کی بنا پر ان غزلیات کو علیحدہ کیا۔ جن کے اشعار اُن تذکروں میں منتخب کئے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اس تلاش و تحقیق کے دوران میں ہمیں کلامِ غالب کے ایسے نادر معاصرانہ نسخوں کا سراغ مل گیا جو ان تذکروں کے اشعار سے کہیں زیادہ مکمل اور قابلِ اعتماد تھے اور جنہوں نے ہمیں بہت حد تک ان تذکروں سے بے نیاز کر دیا۔ کلامِ غالب کی موجودہ تاریخی تدوین بیشتر انہی نسخوں پر مبنی ہے۔ غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے وقت ہم نے دیوانِ غالب اُردو طبع اوّل (مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب) قلمی نسخہ میخانۂ آرزو (بانکی پور لائبریری)۔ قلمی نسخہ دیوانِ فارسی (رامپور لائبریری)، نسخۂ حمیدیہ اور تذکرۂ گلشنِ بے خار سے خاص طور پر استفادہ کیا تھا۔ دوسری اشاعت کے لئے قلمی نسخۂ دیوان اُردو (مملوکہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی) دیوان اُردو طبع ثانی (۱۸۴۷ء) اور دیوان فارسی طبع اوّل (۱۸۴۵ء) سے مدد لی تھی۔ اور اب ان مآخذ کے علاوہ رام پور کے اس قلمی نسخہ سے مدد لی ہے۔ جس کے شروع میں منتخب اُردو دیوان سے دیباچہ کی تاریخِ تحریر ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۸ھ درج ہے۔ ان سب سے مستفید ہونے کے بعد ہم نے کلامِ غالب کو مندرجہ ذیل پانچ دَوروں میں ترتیب دیا ہے:-

پہلا دَور

۱۸۰۶ء (؟) ۱۸۲۱ء

اِس دَور میں ان اشعار کا انتخاب ہے۔ جو پچیس ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ اور نسخۂ حمیدیہ کے متن میں موجود ہیں۔ ہم نے ان اشعار کو تمام کا تمام درج کرنے کے بجائے فقط انتخاب دینے پر اس لئے اکتفا کی ہے۔ کہ اس دَور کے اشعار کو مفتی انوار الحق نے بھی باقی اشعار سے علیحدہ شائع کیا ہے۔ تمام اشعار کو مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ سے نقل کرنے کے لئے نہ کسی

خاص محنت کی ضرورت ہے۔ اور نہ اس میں کوئی ادبی مصلحت ہے۔ یہ اشعار بیشتر دقیق اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے کم پایہ ہیں۔ جو حضرات غالب کے ابتدائی دُور کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیں۔ ان کے لئے مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ میں ابتدائی غزلیات علیحدہ ترتیب دی ہوئی موجود ہیں۔ ہم نے فقط ایسے اشعار کا انتخاب دیا ہے۔ جو ادبی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہیں۔ اور غالب کے ابتدائی طرزِ شاعری کو بھی نمایاں کرتے ہیں +

دُوسرا دَور

۱۸۲۱ء ۔ ۱۸۲۷ء

اس ضمن میں وہ اُردو اشعار ہیں جو نُسخۂ حمیدیہ کے متن میں درج نہیں۔ لیکن اس قلمی نسخے میں موجود ہیں۔ جو پروفیسر شیرانی کے کتب خانے کی زینت ہے۔ اس نسخے پر تاریخِ کتابت درج نہیں۔ لیکن داخلی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ نسخہ مرزا کے سفرِ کلکتہ (۱۸۲۶ء) سے کچھ عرصہ پہلے لکھا گیا۔ اور مرزا کی وہ غزلیں جو اس سفر کے دوران میں لکھی گئیں۔ اس نسخے کے حاشیے پر درج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ دہلی یا لکھنؤ میں کوئی صاحب تھے۔ جنہیں مرزا اثنائے سفر میں اپنا کلام بھیجتے رہے۔ حاشیے کی دو غزلوں کے متعلق تصریح ہے۔ کہ وہ باندہ سے بھیجی گئیں۔ ان دو غزلوں کے مطلعے درجِ ذیل ہیں ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور ؎

آبرو کیا خاک اس گُل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ان میں سے پہلی غزل کے ساتھ "از باندہ فرستادند" اور دوسری سے پہلے "از باندہ رسید"

لکھا ہُوا ہے ۔ اسی طرح قیامِ لکھنؤ کی ذیل کی اُردو غزل بھی اس نسخے کے حاشیے پر موجود ہے ۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

اس قلمی نسخے کے متعلق ابھی مزید تحقیق اور غور و خوض کی ضرورت ہے اور شاید بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ اگرچہ اس نسخے میں ۱۸۲۷ء سے پہلے کے قریب قریب سب اشعار درج ہیں لیکن اسے پھر بھی اس زمانے تک کے اشعار کا مکمل مجموعہ نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کے بیچ اور آخر کے چند صفحات غائب ہیں ۔ اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نسخہ کلامِ غالب کی تاریخی تدوین میں بڑا کارآمد ہے ۔ اور اس کی رو سے اُس زمانے کے اشعار بہت حد تک معین ہو سکتے ہیں جب مرزا اُردو چھوڑ کر فارسی کو اپنی زبانِ شعر و سخن بنا رہے تھے ۔

---

[1] جس وقت یہ دیوان نقل کیا گیا (فی ۱۸۲۶ء) اس وقت مرزا ابتدائی کلام پر نظرِ ثانی کر رہے تھے ۔ چنانچہ کئی پہلی غزلوں کے نئے تتمے نسخۂ شیرانی کے متن میں موجود ہیں ۔ لیکن دیوانِ ریختہ کے انتخاب کی نوبت ابھی تک نہ آئی تھی ۔ مرزا غالب نے ایک خط میں حکیم احسن اللہ خان کو دیوانِ ریختہ کا فارسی دیباچہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے ۔ حالی کا بیان ہے ۔ کہ یہ خط کلکتہ سے لکھا گیا ۔ اور خط کی عبارت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے ۔ اگر یہ خط موجودہ منتخب دیوان کے متعلق ہے ۔ تو شاید یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہو ۔ کہ اُردو دیوان کا انتخاب قیامِ کلکتہ کے دوران میں ہُوا ۔ چونکہ گلِ رعنا میں بعض ایسے اشعار منتخب ہُوئے ہیں ۔ جنہیں مرزا نے منتخب اُردو دیوان سے خارج کر دیا ۔ اس لئے قرینِ قیاس ہے ۔ کہ یہ انتخاب گلِ رعنا کی ترتیب کے بعد ہُوا ۔ عجب نہیں کہ گلِ رعنا کی ترتیب کے دوران میں مرزا کو منتخب اُردو دیوان مرتب کرنے کا خیال پیدا ہُوا ہو !

تیسرا دور

۱۸۲۷ء - ۱۸۴۷ء

اس دَور کے فارسی اشعار کو ہم نے تین مختصر دوروں میں تقسیم کیا ہے۔

(ا) لالۂ صحرا ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۰ء تک۔ یعنی ان اشعار کا انتخاب جن کے متعلق داخلی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ سفرِ کلکتہ کے دوران میں لکھے گئے +

(ب) گُلِ رعنا ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۸ء تک یعنی ان اشعار کا انتخاب جو غالباً سفرِ کلکتہ کے بعد لکھے گئے۔ لیکن قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری (۱۸۳۸ء) میں موجود ہیں +

(ج) بادۂ شیراز ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۷ء تک۔ یعنی اُن اشعار کا انتخاب جو قلمی نسخہ بانکی پُور کے بعد لکھے گئے۔ لیکن دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں موجود ہیں۔ یا دوسرے ذرائع سے اس دَور میں شمار کئے جا سکتے ہیں +

(د) گُلبنِ ہندی۔ اس بیس سال کے عرصے میں مرزا کی توجہ زیادہ تر فارسی شعرگوئی کی طرف تھی۔ لیکن کبھی کبھار وہ اُردو شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ ان اُردو اشعار کو جو نسخۂ شیرانی کے متن یا حاشیے میں نہیں۔ لیکن دیوان غالب کے دوسرے مطبوعہ ایڈیشن (مئی ۱۸۴۷ء) میں موجود ہیں۔ ہم نے گُلبنِ ہندی کے تحت جمع کیا ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں وہ اشعار ہیں۔ جو نسخۂ شیرانی میں نہیں۔ لیکن رام پور لائبریری کے اس قلمی نسخہ میں ہیں جس کے شروع میں دیباچہ مورخہ ۲۴؍ ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ ہجری درج ہے۔ (ان اشعار کی تفصیل ہمیں مولوی امتیاز علی عرشی مہتمم کتب خانۂ رام پور کی عنایت سے دستیاب ہوئی۔) دوسرے حصّے میں وہ اشعار ہیں۔ جو رام پور کے اس قدیمی نسخہ میں نہیں۔ لیکن دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن میں موجود ہیں۔ جو اشعار پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۱) میں بھی موجود تھے۔ ان کی علیحدہ تصریح کر دی گئی ہے +

چوتھا دور
۱۸۴۷ء - ۱۸۵۷ء

اس دور میں وہ اردو اشعار ہیں۔ جو اردو دیوان کے دوسرے مطبوعہ نسخہ ۱۸۴۷ء میں درج نہیں۔ لیکن اس قلمی نسخے میں موجود ہیں۔ جو مرزا نے ۱۸۵۷ء میں رام پور بھیجا۔ اس زمانے کے فارسی اشعار کا انتخاب بھی اس دور میں شامل ہے +

پانچواں دور
۱۸۵۷ء - ۱۸۶۹ء

اس دور میں وہ اُردو اور منتخب فارسی اشعار ہیں۔ جو غدر کے بعد لکھے گئے۔ اور جن کی تاریخ تصنیف شاعر کے خطوط یا دُوسرے ذرائع سے معین کی جا سکتی ہے +

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں۔ کہ "مکمل شرح کلام غالب" کی جن پچیس غیر مطبوعہ غزلوں کو مولینا مہر، نیاز فتحپوری، مولینا عبدالباری آسی، مجنوں گورکھپوری اور دوسرے اہل قلم حضرات نے غالب کے نتائج طبع مان لیا ہے۔ انہیں کلام غالب ماننے میں ہمیں تامل ہے۔ ہمارے وجوہ بالاختصار یہ ہیں :-

(۱) جس بیاض سے یہ اشعار نقل ہوئے ہیں۔ اُس کے مالک، مرتب اور کاتب کے متعلق کوئی قابلِ ذکر واقفیت نہیں۔ تاریخ کتابت بھی اس پر درج نہیں۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ "کوئی صاحب شاگرد تھے۔ اُن کو مرزا نے وقت بے وقت رام پور میں یہ غزلیں لکھیں اور وہ اُن کے پاس رہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا تو یہ غزلیں اسی میں شریک کر دی جاوینگی"۔ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے۔ کہ وہ رامپور فقط دو دفعہ گئے۔ ایک دفعہ جنوری ۱۸۶۰ء کے اخیر میں اور دوسری دفعہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں۔ دوسری دفعہ جب مرزا رامپور گئے تو ان کی عمر اڑسٹھ ۶۸ سال سے زیادہ تھی۔ اور صحت کی حالت ناگفتہ بہ۔ ایسی حالت میں یہ خیال کرنا عبث ہے۔ کہ انہوں نے پچیس ایسی غزلیں

لکھی ہونگی جو دقیق خیالات سے پُر ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ غزلیں کسی کی فرمائش پر بھی نہیں لکھی گئیں۔ اور ان میں نواب رامپور کی طرف کسی جگہ اشارہ نہیں۔ مرزا نے بہادر شاہ کی فرمائش پر جو غزلیں لکھیں۔ ان میں بادشاہ کا ذکر اکثر آجاتا ہے۔ اب اگر مرزا نے یہ غزلیں بامرِ مجبوری فرمانروائے رامپور کے ارشاد پر لکھیں تو کم از کم ایک غزل میں تو نواب کا ذکر ہوتا۔ غالب نے رام پور کا پہلا سفر ۱۸۶۰ء میں اختیار کیا۔ اس سفر کے دوران میں انہوں نے نواب ضیاء الدین کی فرمائش پر نواب صاحب رام پور سے اپنے دیوان کا نسخہ لے کر نواب ضیاء الدین کے پاس بھیجا۔ واپسی پر میرٹھ اُترے تو منشی ممتاز علی نے ان سے طباعت کے لئے دیوان مانگا۔ اور جیسا کہ مرزا کے خطوں سے ظاہر ہے۔ اُنہوں نے نواب ضیاء الدین سے یہ نسخہ لے کر میرٹھ بھیج دیا۔ اب اگر ان پچیس غزلوں کے متعلق یہ بیان درست ہے کہ وہ دیوان کی طباعت کے وقت شامل کی جانے والی تھیں۔ تو بڑا تعجب ہے کہ اس فیصلے کے تھوڑے عرصے بعد جب مرزا نے میرٹھ میں اپنے دیوان کی اشاعت کا انتظام کیا تو اپنے تازہ ترین کلام کو اس میں شامل نہ کیا۔

(۳) مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے اُردو خطوط موجود ہیں۔ لیکن رام پور کے سفر میں وہ غالب کے شریک نہ تھے۔ غالب انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:- "قبلہ و کعبہ، فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ۔ چہار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازمِ رام پور ہوں گا۔ . . . . . . اب جو کوئی خط آپ بھیجیں۔ مکان کا پتہ لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔" ظاہر ہے کہ اگر شاکر صاحب رام پور ہوتے تو انہیں مرزا کے نام (اور شہر کے نام سے) خط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ غالب کے خطوط میں مولوی عبدالرزاق کے سوا اور کسی شاکر کا ذکر نہیں۔

(۴) اس زمانے میں مرزا نے جو غزلیں لکھیں۔ اُن کے خیالات سادہ اور زبان صاف ہے۔ مثلاً ؎

مَیں ہُوں مُشتاقِ جفا۔ مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اِس سے سوا اور سہی

لیکن مولینا آسی نے جو اشعار شائع کیے ہیں۔ اُن میں سے اکثر دقیق ہیں۔ اور مرزا کے اِس زمانے کے طرزِ شعر گوئی کے مطابق نہیں۔ جو اشعار سادہ ہیں وہ بھی مرزا کے کلام کی ان خصُوصیات سے عاری ہیں۔ جو ان کے اس زمانے کے اُردو اشعار کا مابہ الامتیاز ہیں۔ ایک شعر تو ایسا ہے کہ اُس کے پڑھنے سے میر امانی اسدؔ کا وہ مقطع یاد آتا ہے۔ جس کی وجہ سے مرزا نے اپنا تخلص بدل دیا تھا ؎

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے

(۵) مرزا کے علاوہ غالب علی خان اور تین دوسرے شعرا کا بھی تخلص غالب تھا۔ اگر بیاض کے سارے اشعار غالب کے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ کسی اور غالب کے ہوں۔ مرزا کے یقیناً نہیں +

ان وجوہ کی بنا پر ان غیر مطبوعہ غزلیات کو ہم نے مرزا غالب کے اشعار نہیں مانا۔ اور ان کا انتخاب اُن کی شاعری کے کسی دَور میں نہیں دیا +

فہرست مآخذ

۱۔ دیوانِ غالب اردو قلمی نسخہ بھوپال لائبریری ۱۸۲۱ء
۲۔ دیوانِ غالب اردو قلمی نسخہ مملوکہ پروفیسر محمود خان صاحب شیرانی (۱۸۲۷ء ؟)
۳ منتخب دیوانِ غالب اردو قلمی (۱۲۴۸ھ) رام پور اسٹیٹ لائبریری
۴ میخانۂ آرزو (فارسی نظم و نثر) قلمی نمبر ۱۴۲ خدا بخش لائبریری (۱۸۳۸ء)
۵ دیوانِ غالب فارسی قلمی نمبر ۹۰ خدا بخش لائبریری بانکی پور (۱۸۴۱ء)
۶ دیوانِ غالب اردو مطبوعہ (۱۸۴۱ء) مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب
۷ دیوانِ غالب فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء رام نگر سٹیٹ (بنارس) لائبریری
۸ دیوانِ غالب اردو مطبوعہ ۱۸۴۷ء
۹ دیوانِ غالب فارسی (قلمی، ۱۸۴۷ء (؟)) رام پور لائبریری
۱۰ دیوانِ غالب اردو قلمی نسخہ نمبر ۱۵۲ رام پور اسٹیٹ لائبریری (۱۸۵۷ء)
۱۱ دیوانِ غالب (اردو) مطبوعہ
۱۲ کلیاتِ نظم فارسی (مطبوعہ)
۱۳ سبدِ چین (مطبوعہ)

ریختہ

رنگِ بیدل
بادۂ نیم رس
۱۸۰۷ء (؟) تا ۱۸۲۱ء

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے!

دیباچۂ دیوانِ ریخته

مشام شمیم آشنایاں را صلا۔ و نهادِ انجمن نشیناں را مژده۔ که لختے از سامانِ مجمره گردانی آماده و دامنے از عودِ هندی دست بهم داده است۔ نه چو بهائے سنگِ شعب خورده بهنجار ناطبعی شکسته بے اندام تراشیده بلکه به تیزی تیشهٔ فکر بکار ریز ریز کرده لیبوهاں خراشیده۔ اے دوں نفس گداختگی هائے شوق جستجوئے آتش پارسی است نه آتشے که در گلخنهائے هند افسرده و خاموش و از کفِ خاکستر به برگِ خودش سیه پوش۔ مبنی چه بر روئے مسلم است تابناکی باستخوانِ مرده نابار شکستن و از دیوانگی بر تربتِ شمعِ مزارِ کشته آویختن۔ هر آئینه بدل گداختن سزد در بزم افروختن را نشاید۔ رخِ آتش به شمع برافروزنده و آتش پرست را به باد فراهم در آتش سوزنده نیک میداند که پژوهنده در هوائے آں رخشنده آذر نعل در آتش است۔ که بچشمِ روشنی هوش سنگ از سنگ بیروں تافته و در ایوانِ لهراسپ نشو و نما یافته۔ حسن را فروغ است و لاله را رنگ و دمغ را چشم و گل را چراغ بخشنده۔ یزداں دروں بحسن برافروز را سپاسم که شرارے ازاں آتش تابناک در خاکسترِ خویش یافته ام و بکاوکاوِ سینه شتافته ام۔ داد نفس دمه براں بر نهاده بود که در کم مایهٔ روزگاراں آنمایه فراهم تواند آمد که مجمره را فروغِ روشنائی چراغ و رائحهٔ عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید۔ همانا نگارندهٔ ایں نامه را آں در سر است که پس از انتخابِ دیوانِ ریخته بگرد آوردن سرمایهٔ دیوانِ فارسی برخیزد و استفانتهٔ کمال ایں فرلوریه فن پس زانوئے خویش نشیند۔ امید که سخن سرایانِ سخنور ستائے پراگنده ابیاتے را که خارج ازیں اوراق یابند از آثارِ تراوشِ رگِ کلکِ ایں نامه سیاه نشناسند۔ و جامه گرد آور را در ستائش و نکوهشِ آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔ یارب ایں بوئے هستی ناشنیده و از نیستی به پیدائی نارسیده یعنی نقش بضمیر آمدهٔ نقاش که اسدالله خاں موسوم به میرزا نوشه معروف غالب متخلص است چناں که اکبرآبادی مولد و دهلوی مسکن است فرجامِ کار نجفی مدفن نیز باد۔

تمام شد بست و چهارم شهر ذیقعده سنه ۱۲۴۸ هجری

غالب

تشریحات

۱ - غالبؔ نے جو اشعار ابتدائے شعر گوئی سے پچیس برس کی عمر تک لکھے ۔ انہیں ہم نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔

(ا) رنگِ بیدلؔ کے ضمن میں اُن غزلوں کے اشعار درج ہیں جنہیں مروجہ دیوان مرتب کرتے وقت مصنف نے بالکل نظر انداز کر دیا اور جو غالباً بالکل ابتدائی شعر گوئی کا نمونہ ہیں ۔ اُن میں سے ہم نے ایسے اشعار کا انتخاب دیا ہے ۔ جو شاعر کی ابتدائی طرزِ شاعری کو نمایاں کرتے ہیں اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی بے مایہ نہیں +

(ب) بادۂ نیم رس کے تحت ان غزلیات اور قصائد کا انتخاب ہے جنہیں شاعر نے پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھا تھا ۔ اور جنکے اکثر اشعار منتخب دیوانِ ریختہ میں موجود ہیں +

۲ - ان صفحات میں جب کسی شعر کے مقابل "م" درج ہو تو اس سے یہ سمجھنا چاہیئے ۔ کہ اگرچہ ردیف اور قافیے کی وحدت کی وجہ سے یہ شعر باقی اشعار کے ساتھ درج ہے ۔ لیکن یہ اس دَور کا نہیں بلکہ شاعر نے بعد میں اضافہ کیا ہے +

۳ - جہاں کسی شعر کے بالمقابل "ق" درج ہو وہاں اس شعر کو اس سے پہلے دَور کا شعر سمجھنا چاہیئے +

۴ - جہاں ایک غزل کے چند اشعار ایک لکیر کے بعد درج ہیں وہ اس دَور کے نہیں بلکہ شاعر نے بعد میں اضافہ کئے ہیں ۔ عموماً ایسے اشعار دورِ اوّل کے دوسرے حصے میں ملینگے جنہیں شاعر نے دیوان مرتب کرتے وقت (یعنی دوسرے دَور میں) اضافہ کیا +

رنگِ بیدلؔ

غزلیات

بشغلِ انتظارِ مہ وشاں در خلوتِ شب ہا   سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں   نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا
عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے   رفوئے زخم کرتی ہے بنوکِ نیشِ عقرب ہا
مجھے ہے حسنِ خوباں پردے میں مشاطگی اپنی   کہ ہے تہ بندیٔ خطِ سبزہ خط در تہِ لب ہا
فنا کو عشق ہے بے مقصداں حیرت پرستاراں   نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسدؔ کو بُت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ "یارب" ہا

یک گامِ بیخودی سے لوٹیں بہارِ صحرا   آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا
وحشت اگر رسا ہے۔ بیحاصلی ادا ہے   پیمانہ ہوا ہے۔ مُشتِ غبارِ صحرا
اے آبلہ کرم کر۔ یاں رنجہ اک قدم کر   اے نورِ چشمِ وحشت۔ اے یادگارِ صحرا
دِل در رکابِ صحرا۔ خانہ خرابِ صحرا   موجِ سرابِ صحرا عرضِ خمارِ صحرا

ہر ذرّہ یک دلِ پاک آئینہ خانۂ خاک   تمثالِ شوقِ بیباک صد جا دوچار صحرا
دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے
در سر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا

وحشی بنِ صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا

مہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ
ماہ کو در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا   کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا
زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی نے   چمن بالیدنی ہا از رمِ نخچیر ہے پیدا
نہیں ہے کف لبِ نازک پہ فرطِ نشۂ مے سے   لطافت ہائے جوشِ حسن کا سر شیر ہے پیدا
عروجِ ناامیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے   بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا
اسدؔ جس شوق سے ذرّے تپش فرسا ہوں روزن میں
جراحت ہائے دل سے جوہرِ شمشیر ہے پیدا

بہ مہرِ نامہ جو بوسہ گل پیام رہا   ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد   بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا

دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے   ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل   پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا   کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا
نہ پوچھ حالِ شب و روزِ ہجر کا غالب
خیالِ زلف و رخِ دوست صبح و شام رہا

ہے بہاراں میں خزاں پرور خیالِ عندلیب   رنگِ گل آتشکدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب
عشق کو ہر رنگ شانِ حسن ہے مدِ نظر   مصرعِ سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب
عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حسنِ یار   گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
منع مت کر حسن کی ہمکو پرستش سے کہ ہے   بادۂ نظارۂ گلشن حلالِ عندلیب
ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کارِ اسد
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

ناخنِ دخلِ عزیزاں یک قلم ہے نقب زن   پاسبانیٔ طلسمِ کنجِ تنہائی عبث
محملِ پیمانۂ فرصت ہے بردوشِ حباب   دعوئے دریاکشی و نشۂ پیمائی عبث
اے اسد بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز   عالمِ تسلیم میں یہ دعوئے آرائی عبث
قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت
م
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ   رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی   ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ
تمثالِ گداز آئینہ ہے عبرتِ بینش   نظارہ تحیر۔ چمنستانِ بقا ہیچ
گلزارِ دمیدن، شررستانِ رمیدن   فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ
آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے   ہستی میں نہیں شوخیِ ایجادِ صدا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا   سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند   اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند!
ویرانیے جز آمد و رفتِ نفس نہیں   ہے کوچہ ہائے نے میں غبارِ صدا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دوست   مژگانِ باز ماندہ سے دستِ دعا بلند
موقوف کیجیے یہ تکلف نگاریاں   ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند
ہے دلبری کمیں گہِ ایجادِ یک نگاہ   کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اسدؔ
در ہر نفس بقدرِ نفس ہے قبا بلند

حسرتِ دستگہ و پائے تحمل تا چند   رگِ گردن خطِ پیمانۂ بے مُل تا چند
کوکبِ بخت بجز روزنِ پُر دود نہیں   عینکِ چشمِ جنوں حلقۂ کاکل تا چند
چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ   بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند

بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پرِ گُل   شمع و گُل تا کَے و پروانہ و بُلبل تا چند
نالہ دامِ ہوس و دردِ اسیری معلُوم   شرح برخود غلطیہائے تحمّل تا چند
سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ حنا   ناکسی! آئینۂ نازِ توکّل تا چند

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کُن یک خلق! تغافل تا چند

بہ کامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد   ہُوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد
کمالِ بندگیٔ گُل ہے رہنِ آزادی   زدستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں فریاد
نوازشِ نفسِ آشنا کہاں ورنہ   بہ رنگِ نَے ہے نہاں در رگِ اُستخواں فریاد
تغافل آئینہ دارِ خموشیٔ دل ہے   ہُوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد
ہلاکِ بے خبریٔ نغمۂ وجُود و عدم   جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد
جوابِ سنگدلیہائے دُشمناں ہمّت   زدستِ شیشہ دلیہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

شیشۂ آتشیں رُخِ پُر نور   عرق از خطِ چکیدہ روغنِ مور
بسکہ ہُوں بعدِ مرگ بھی نگراں   مردمک سے ہے خال بر لبِ گور
بار لاتی ہے دانہائے سرشک   مژہ سے ریشۂ رزِ انگور
ظلم کرنا گدائے عاشق پر   نہیں شاہانِ حُسن کا دستور

دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے   دُشمنی ہے وصال کا مذکور
زندگانی پہ اعتماد غلط   ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور
کیجے چوں اشک ۔ اور قطرہ زنی
اے اسدؔ ہے ہنوز دلّی دور

بینشِ بسعیِ ضبطِ جنوں نوبہار تر   دل در گدازِ نالہ بہ کاہ آبیار تر
قاتل بعزمِ ناز و دل از زخم در گداز   شمشیر آبدار و نگاہ آبدار تر
ہے کسوتِ عروجِ تغافل کمالِ حُسن   چشمِ سیہ بمرگِ نگہ سوگوار تر
اے چرخ خاک برسرِ تعمیرِ کائنات   لیکن بنائے عہدِ وفا اُستوار تر
آئینہ داغ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیماب بیقرار و اسدؔ بے قرار تر

گو بیابانِ تمنّا و کُجا جولانِ عجز   آبلے پا کے ہیں یاں رفتار کو دندانِ عجز
ہو قبولِ کم نگاہی تحفۂ اہلِ نیاز   اے دل و اے جانِ ناز اے دین و ایمانِ عجز
بوسۂ پا انتخابِ بدگمانیہائے حُسن   یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز
حُسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمیہائے ناز   عشق نے وا کی ہے ہر یک خار سے مژگانِ عجز
وہ جہاں مسند نشینِ بارگاہِ ناز ہو   قامتِ خوباں ہے محرابِ نیازستانِ عجز
بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت اے اسدؔ
گردباد اس راہ کا ہے عقدۂ پیمانِ عجز

نہ بندھا تھا عدمِ نقشِ دلِ مور ہنوز
تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز
صد تجلّی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت
پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طُور ہنوز
پا۔ پُراز آبلہ، راہِ طلبِ مے میں ہُوا
ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگُور ہنوز
گُل کھلے، غنچے چٹکنے لگے، اور صبح ہُوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز
اے اسدؔ، تیرگیٔ بختِ سیہ ظاہر ہے
نظر آتی نہیں صُبحِ شبِ دیجُور ہنوز

حاصلِ دلبستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس
وقفِ عرضِ عقدہ ہائے مُتصل تارِ نفس
کیوں نہ طوطیٔ طبیعت نغمہ پیرائی کرے
باندھتا ہے رنگِ گُل آئینہ بر چاکِ قفس
اے ادا فہماں صدا ہے تنگیٔ فرصت سے خوں
ہے بصحرائے تحیّر چشمِ قربانی جرس
تیز تر ہوتا ہے خشمِ تندرویاں عجز سے
ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہ خار و خس
سختیٔ راہِ محبت منعِ دخلِ غیر ہے
پیچ و تابِ جادہ ہے یاں جوہرِ تیغِ عسس
اے اسدؔ ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیّادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبُوس و بس
پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس
ہے تصوّر میں نہاں سرمایۂ صد گُلستاں
کاسۂ زانو ہے مُجھ کو بیضۂ طاؤس و بس
کفر ہے، غیر از دفورِ شوق، رہبر خواستن
راہِ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس و بس
یک جہاں گُل تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسدؔ
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

عشاق اشکِ چشم سے دھو دیں ہزار داغ
دیتا ہے اور جوں گل و شبنم بہار داغ
جوں اعتمادِ نامہ و خط کا ہو مُہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار داغ
بجھتے ہیں نسبتِ جلوۂ خود سے ستارگاں
دیکھ اسکو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ
وقتِ خیالِ جلوۂ حُسنِ بتاں اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

بُلبلوں کو دُور سے کرتا ہے منعِ بارِ باغ
ہے زبانِ پاسباں خارِ سرِ دیوارِ باغ
کون آیا جو چمن بے تابِ استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیٔ رفتارِ باغ
آتشِ رنگِ رُخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سرو صبا سے گرمیٔ بازارِ باغ
کون گل سے ضعفِ خاموشیٔ بلبل کہہ سکے
نے زبانِ غنچہ گویا نے زبانِ خارِ باغ
جوشِ گل کرتا ہے استقبالِ تحریرِ اسدؔ
زیرِ مشقِ شعر ہے نقش از پئے احضارِ باغ

عیسیٰ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف
درد آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف
سنجیدگی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن
خوابِ گرانِ خسروِ پرویز یک طرف
خرمن بباد دادہ دعوے ہیں ہو سو ہو
ہم اک طرف ہیں برقِ شرر بیز یک طرف
ہر مُو بدن پہ شہپرِ پروانہ ہے مجھے!
بیتابیٔ دلِ تپش انگیز یک طرف
یک جانب اے اسدؔ شبِ فرقت کا بیم ہے
دامِ ہوس ہے زلفِ دلآویز یک طرف

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال   غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال
بسکہ ہے اصلِ دمیدنہا غبار   ہے نہالِ شکوۂ ریحاں سفال
نور سے تیرے ہے اِس کی روشنی   ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

ہو جو بلبل بیرۂ فکرِ اسدؔ
غنچہ منقارِ گل ہو زیرِ بال

ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم   رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
رسیدن گلِ باغ واماندگی ہے   عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم
نفس ہو نہ معزولِ شعلہ درودن   کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم
تغافل کمینگاہِ وحشت شناسی   نگہبانِ دلہائے اغیار ہیں ہم
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن   بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں   نگاہ آشنائے گُل و خار ہیں ہم

اسدؔ! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجُومِ تمنا سے لاچار ہیں، ہم

ڈرتا ہوں کوچہ گردئ بازارِ عشق سے   ہیں خارِ راہ، جوہرِ تیغِ عسس تمام
اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی   یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام
گذرا جو آشیاں کا تصور بوقتِ بند   مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسدؔ
اب کی بہار کا یُونہی گذرا برس تمام

سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں   شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
کی متّصل ستارہ شماری میں عمر صرف   تسبیحِ اشکہائے زمژگاں چکیدہ ہوں
ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج م   مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتنگاں کو سخن سے سرِ تپش   مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں
جوں بوئے گُل ہوں گرچہ گرانبارِ مشتِ زر
لیکن اسے بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں
خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں   خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں
مَیں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب   لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں
تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہُوا حصول   اے بے خبر! مَیں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں
پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو   مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں
سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا   یارب مَیں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں
میرا نیاز و عجز ہے مُفتِ بتاں اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں
فتادگی میں قدم اُستوار رکھتے ہیں   برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
طلسمِ مستیِ دل آنسوئے ہجومِ سرشک   ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں
ہوا ہے گریۂ بیباک ضبط سے تسبیح   ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ
بسانِ دشت دلِ پُرغبار رکھتے ہیں

ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں
دامنِ تمثال آبِ آئینہ سے تر نہیں
ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور
لخت لختِ شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں
ہے فلک بالا نشینِ فیضِ خم گردیدنی
عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں
کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ
میکدے میں ز دل افسردگیٔ بادہ کشاں
موجِ مے مثلِ خطِ جام ہے ہر جا ماندہ
خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت و بیاں
ہے سخن گرد ز دامانِ ضمیر افشاندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ
حیف بے حاصلیٔ اہلِ ریا پر غالبؔ
یعنی ہیں ماندہ ز آں سُو و ازیں سُو راندہ

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ
وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ
گاہ بہ خلد امیدوار گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ
اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ
شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دارِ ہمدگر
خار کو بے نیامِ جاں، ہم کو برہنہ پا سمجھ

ہے خطِ عجز مادِ تو ، اوّل درسِ آرزو
ہے یہ سیاقِ گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ
نغمہ ہے محو سازرہ ، نشہ ہے بے نیازرہ
رندِ تمام نازرہ ، خلق کو پارسا سمجھ
نے سروبرگِ آرزو ، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جان خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ
لغزشِ پا کو ہے بلد ، نغمۂ یا علی مدد
ٹوٹے گر آئینہ اسدؔ سبحہ کو خوں بہا سمجھ

پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی
ہم کو جلدی ہے مگر تُو نے قیامت ڈھیل کی
کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید
ہے جو آبی پیرہن ہر مَوجِ رُودِ نیل کی
مُدعا در پردہ ۔ یعنی جو کہوں باطل سمجھ
وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی

کیا ہے ترکِ دُنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خراجِ دیہہ ویراں یک کفِ خاک
بیاباں خوش ہُوں تیری عاملی سے
پر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ ۔ اپنی کاہلی سے
خُدا ۔ یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم دربدر ناقابلی سے
اسدؔ قربانِ لُطفِ جورِ بیدل
خبر لیتے ہیں لیکن بے دلی سے

بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے
یک قلم شاخِ گلِ نرگس عصائے کور ہے
ہے عجب مردوں کو غفلت ہائے اہلِ دہر پر
سبزہ جوں انگشتِ حیرت در دہانِ گور ہے
حسرت آبادِ جہاں میں ہے الم غم آفریں
نوحہ گویا ، خانہ زادِ نالۂ رنجور ہے

کیا کروں غمہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار   دزد گر ہو خانگی تو پاسباں مجبور ہے
جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفٰےؐ   اس جگہ تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے
ہے وہاں تکلیفِ عرضِ بے دماغی اے اسدؔ
یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ رنجور ہے

یہ سرنوشت میں میری ہے اشک افشانی   کہ موجِ آب ہے ہر ایک چینِ پیشانی
لبِ نگار ہیں آئینہ دیکھ آبِ حیات   بہ گمرہی سکندر ہے محوِ حیرانی
کہوں وہ مصرعِ برجستہ وصفِ قامت میں   کہ سرو ہو نہ سکے اس کا مصرعِ ثانی
اسدؔ نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا
کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

ہُوا جب حُسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے
کہ بعد از صافِ مے ساغر میں دُردِ بادہ آتا ہے
نہیں ہے مزرعِ اُلفت میں حاصل غیرِ پامالی
نظر دانہ سرشکِ برزمیں اُفتادہ آتا ہے
محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اِک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے
دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں
متاعِ زندگانی ہا بہ غارت دادہ آتا ہے

اسدؔ وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے   وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو   زیادہ اُس سے گرفتار ہوں کہ تُو جانے
جنوں فسردۂ تمکیں ہے، کاش، عہدِ وفا   گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے
نہ ہووے کیونکہ اسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا   لہو میں ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے
زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم   مگر، وہ خانہ بر اندازِ گفتگو جانے

مسیح کُشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو اسدؔ تپشِ نبضِ آرزو جانے

کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے   ناخنِ انگشتِ خوباں لعلِ وا ژوں، ہے مجھے
ریشۂ شہرت دوانیدن ہے رفتن زیرِ خاک   خنجرِ جلاد برگِ بید مجنوں ہے مجھے
ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج   آرزوئے بوسۂ لبہائے میگوں ہے مجھے
ہو گئی باہم گر جوشِ پریشانی سے جمع   گردشِ جامِ تمنا دورِ گردوں ہے مجھے
دیکھ لے جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب   بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے

غنچگی ہے بر نفس پیچیدنِ فکر اے اسدؔ
در شگفتن ہائے دل در رہنِ مضموں ہے مجھے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے   غافلاں! آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق   ہر بُتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے
کیا کمالِ عشق نقص آباد گیتی میں ملے   پختگی ہائے تصور یاں خیالِ خام ہے
ہو جہاں وہ ساقیٔ خورشید رُو مجلس فروز
واں اسد تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے
اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے
یک درے بر روئے رحمت بستہ دور شش جہت
نا امیدی ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے
ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی اسد
ہوں سراپا یک قلم تسلیم جہ مولا کرے
توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
م آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے
بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر   وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُر نم ہے
اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ   تمام دفترِ ربطِ مزاج برہم ہے
اسد بہ نازکیٔ طبعِ آرزو انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے
تا چند نازِ مسجد و بُت خانہ کھینچیے   جُوں شمع دل بہ خلوتِ جاناں نہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر   دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچیے
ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے اسدؔ
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

کاشانۂ ہستی کہ برانداختنی ہے   یاں سوختنی چارہ گرِ ساختنی ہے
ہے شعلۂ شمشیرِ فنا حوصلہ افگار   اے داغِ تمنا! سپر انداختنی ہے
ہے سادگیِ ذہن تمنائے تماشا
جائے کہ اسدؔ رنگِ چمن باختنی ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے   کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں فریادِ بے دلاں تجھ سے   چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سُو   بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس   امیدِ محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے   جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیِ رحمت کمیں گرِ تقریب   وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے
اسدؔ! بہ موسمِ گُل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے

حکمِ بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے   باوجودِ مشقِ وحشتہا رمیدن منع ہے
شرمِ آئینہ تراشِ جبہۂ طوفان ہے   آب گردیدن روا لیکن چکیدن منع ہے

بیخودی فرمانروائے حیرت آبادِ جنوں
زخم دوزی جرم و پیراہن دریدن منع ہے
مژدۂ دیدار سے رُسوائیٔ اظہار دُور
آج کی شب چشمِ کوکب تک پریدن منع ہے
بہم طبعِ نازکِ خوباں سے وقتِ سیرِ باغ
ریشۂ زیرِ زمیں کو بھی دویدن منع ہے
یار معذورِ تغافل ہے عزیزاں شفقتے!
نالۂ بلبل بگوشِ گُل شنیدن منع ہے
مانع بادہ کشی ناداں ہے لیکن اے اسد
بے ولائے ساقیٔ کوثر کشیدن منع ہے

خدایا دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خمِ گیسو ہو شمشیرِ سیہ تاب اور شب کاٹے
کریں گر قدر اشکِ دیدۂ عاشق خُود آرایاں
صدف دندانِ گوہر سے بہ حسرت اپنے لب کاٹے
دریغا وہ مریضِ غم کہ فرطِ ناتوانی سے
بہ قدرِ یک نفس جادہ بہ صد رنج و تعب کاٹے
یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے
اسد مجھ میں ہے اُسکے بوسۂ پا کی کہاں جرأت
کہ مَیں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

102067
~~12~~

رنجشِ یارِ مہرباں، عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اُٹھے ہے جو غُبار گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسدؔ! چاہیے ہے دل و دماغ
عذر، کہ یہ فسردہ دِل بے دل و بے دِماغ ہے

رُباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دِل
ہوتے ہیں ملول اس کو سُنکے جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

جُرعات

پھر وہ سُوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم
ہر ایک داغِ جگر آفتابِ محشر ہو
ستم کشی کا کیا دِل نے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط کرو کم بہت ستمگر ہو

جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دِل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

اے غنچۂ تمنا یعنی کفِ نگاریں
دل دے، تو ہم بتا دیں مُٹھی میں تیری کیا ہے
ہر نالۂ **اسدؔ** ہے مضمونِ دادخواہی
یعنی سخن کو کاغذ احرامِ مُدعا ہے

ھزار قافلۂ آرزو بیاباں مرگ ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خودرائی

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائینگے
مرگ سے وحشت نہ کر راہِ عدم پیمُودہ ہے

شورشِ باطن سے یاں تک مجھکو غفلت ہے، کہ آہ شیونِ دل یک سرودِ خانۂ ہمسایہ ہے
اے **اسدؔ**! آباد ہے مُجھ سے جہانِ شاعری
خامہ میرا تختِ سُلطانِ سخن کا پایہ ہے

بادۂ نیم رس

غزلیات

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ   صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے   سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے   مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا   تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے   کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گُل آئینۂ بے مہریٔ قاتل   کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مُبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — ظاہر ہُوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے مُعاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
پُوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر — کس کو دماغِ منتِ گفت و شنُود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — مَیں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجُود تھا
لیتا ہُوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا، اور بُود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رُسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مُدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پُوچھے تم نے کیا مزا پایا
ہے کہاں تمنا کا دُوسرا قدم یارب! — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
سادگی و پرکاری، بےخودی و ہُشیاری — حُسن کو تغافل میں جُرأت آزما پایا
خاک بازیٔ اُمید کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل — خُوں کیا ہُوا دیکھا، گُم کیا ہُوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی   ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا
دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا   قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرّۂ خاک   شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا
بُوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل م   جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب!   تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر   جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد   کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
تھی نوآموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند   سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دِل میں پھر گریہ نے اِک شور اُٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہُوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا   یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہُوا
مَیں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہُوا
دِل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی   گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہُوا
ہُوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی   گوش منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہُوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے   ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسےٰ نہ ہوا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا   تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز   جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا   عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
یاس نے تشنگیٔ شوق کے مضموں چاہے   ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا[ل]
مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا   بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا   بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا   چراغِ خانۂ درویش ہے کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر   رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
دیارِ ہجرتِ بیچارہ جو زنجیرِ رسوائی   عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے   مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے   م   چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

[ل] بعد میں مرزا نے یہ شعر یوں بدل دیا ہے
نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ   گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے
م
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صُورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قلم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھُلا
جادہ اجزائے دوعالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پُوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عُنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہُوں مَیں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پُوچھ
اِسقدر تنگ ہوا دل کہ مَیں زنداں سمجھا
ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جُوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دِل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو مَیں اپنا شبستاں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
دیا جاں کے کیوں اسکو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مُسلماں سمجھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا   گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب   مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو   مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے   مری نگاہ میں ہے جمع وخرچ دریا کا

دل اسکو پہلے ہی ناز وادا سے دے بیٹھے   ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی   دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں   کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو   توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر   خمیازہ یک درازیِ عمرِ خمار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال   ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا
ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب   خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں   جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں **غالب**
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگاں کا
سراپا یک آئینہ دارِ شکستن
ارادہ ہوں یک عالمِ افسردگاں کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا
بصورتِ تکلف، بمعنی تاسف
اسد میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
اِک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو اب اسکے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا
ہر رنگ میں جلا **اسدِ** فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
اسدؔ ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا
غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنّا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا
جاں در ہوائے یک نفسِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل تیرے داد خواہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ۔ صبا آوارہ۔ گُل نا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
مَیں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رنگ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مُونس اور آئینہ تیرا آشنا

یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خُمکدہ کِس کے دماغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا[1]
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہُوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

---

[1] یہ شعر غالب کے پہلے مطبوعہ دیوان میں نہیں۔ اور غالباً ۱۸۴۱ء کے بعد لکھا گیا۔

جلوہ ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے   جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ   عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے شباب   تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا   لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا   بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائیگا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب   پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر   ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ   دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا   یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہُوا   مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائیگا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر   ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل!　　نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی　　پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں　　دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی　　کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے　　خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں　　یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہُوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا　　رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو　　دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں　　جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
م　کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج　　م قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ　　تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل!　　سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
دُور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مُرغِ خیالِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پُوچھ　　برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیٔ وصال نہیں　　اگر یہی عرقِ فتنہ ہے مکرر کھینچ
تجھے بہانہ راحت ہے انتظار اے دل!　　کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

بہ نیمِ غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ
تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ
خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار
نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے   کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے   بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا   کہ پشتِ چشم سے جسکے نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا   کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا   قیامت اِک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا اگر اُس نے شدت کی
م
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دِل باندھا ہے بالِ یک تپیدن پر

میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عُریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہُوئے ہیں قرض رہزن پر

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گُلخن پر

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز   دُعا قبُول ہو یارب کہ عُمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجُود   ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں   کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز
اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے   کہ کھینچیے پرِ طائر سے صُورتِ پرواز

زبسکہ جلوۂ صیّاد حیرت آرا ہے   اڑی ہے صفحۂ خاطر سے صُورتِ پرواز
ہجومِ فکر سے دِل مثلِ مُوج لرزے ہے   کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست   گئی نہ خاک ہُوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پُوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردُوں ہے ایک خاک انداز

نہ گلِ نغمہ ہُوں نہ پردۂ ساز   مَیں ہُوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکل   مَیں اور اندیشہائے دُور و دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی   ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز

ہُوں گرفتارِ الفتِ صیّاد   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دِن ہو کہ اُس ستمگر سے   ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دِل میں مرے وہ قطرۂ خُوں   جس سے مژگاں ہُوئی نہ ہو گلباز
اے ترا جلوہ یک قلم انگیز   اے ترا ظلم سر بسر انداز
تُو ہُوا جلوہ گر مُبارک ہو!   ریزشِ سجدہ جبینِ نیاز
مُجھ کو پُوچھا تو کچھ غضب نہ ہُوا   مَیں غریب اور تُو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہُوا

م

اے دریغا وہ رِندِ شاہد باز!

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع   ہُوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی   یہ بات بزم میں روشن ہُوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام   بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع
غم اُس کو حسرتِ پرواز کا ہے اے شعلہ   ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے   بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پُوچھ   شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مُجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

نامہ بھی لکھتے ہیں تو بخطِ غبار حیف   رکھتے ہیں مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش   مُجبوریاں تلک ہُوئے اے اختیار حیف
بیش از نفس بُتاں کے کرم نے وفا نہ کی   تھا محملِ نگاہ بہ دوشِ شرار حیف
تھی میرے ہی جلانے کو اے آہِ شعلہ ریز   گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
م   اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک   کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل   ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کسقدر پیدا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج   گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
مجھ کو ارزانی رہے۔ تجھ کو مُبارک ہو جیو   نالۂ بُلبُل کا درد اور خندۂ گُل کا نمک
داد دیتا ہے مِرے زخمِ جگر کی واہ واہ   یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے   دِل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد   م زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دِن کہ وجدِ ذوق میں
م   زخم سے گرتا تو مَیں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک   کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ   دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب   دِل کا کیا رنگ کروں خُونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں
بوسے کو پُوچھتا ہُوں مَیں مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں
پُرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اِک اشارے سے نِکلے ہے یہ ادا کہ یُوں
رات کے وقت مَے پیئے ، ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خُدا کرے پر نہ کرے خُدا کہ یُوں
بزم ہیں اُس کے رُوبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مُدعا کہ یُوں
مَیں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ "یُوں"

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا ، تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا - اور یہ دیکھنا کہ یُوں
مجھ سے کہا جو یار نے ، جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خُودی - چلنے لگی ہوا کہ یُوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی - حیرتِ نقشِ پا کہ یُوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتہ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں   ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے   جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو   خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے   لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے   کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
م
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں   ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر!   برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم   اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے   ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل   مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ   لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں   آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو   کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی   بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آجا دے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو
جز دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ   آئینہ عرض کر خط و خالِ بیاں نہ پوچھ
ہندوستان سایۂ گُل پائے تخت تھا   سامانِ بادشاہیٔ وصلِ بتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے   عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ
ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ   م جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے   م دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل
دردِ جدائیٔ اسداللہ خاں نہ پوچھ
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے   طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
ہستی فریبِ نامۂ موجِ سراب ہے   یک عمر نازِ شوخیٔ عنواں اٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق   یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے
ضبطِ جنوں سے ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز   یک نالہ بیٹھیے تو نیستاں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم   اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے   یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

انگور سعیٔ بے سرو پائی سے سبز ہے
غالبؔ بدوشِ دل خمِ مستاں اُٹھائیے

ہے بزمِ بُتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دَورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا   یک بار لگادو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ مے کدہ گستاخ ہیں زاہد   زنہار نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فُرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مِرے مکتوب کا یارب!
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بُتوں کے ناز اُٹھانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شُعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دِل میں سوزِ غم چھُپانے کی
انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی!

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف۔ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے، اک موجِ خوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نظر راحت پہ میری۔ کر نہ وعدہ شب کے آنے کا
کہ میری خواب بندی کے لیۓ ہوگا فسوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

سر گشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید۔ کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
کیا غم ہے اُس کو جس کا علی سا امام ہو
اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے
ہر اِک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا!
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
مشکیں لباس کعبہ علیؑ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے۔ نہ کہ نافِ غزال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
م
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے
ہُوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے
تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
اسدؔ یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے
رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گذرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
تا چند پستِ فطرتیِ طبعِ آرزو
یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے   اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی م جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کرے ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مُدعا مجھے م

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی   مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے   اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا   ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بیباکیٔ مستاں   نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت م کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اُسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے م مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی
اسد جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے　　طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے　　نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو　　ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر　　خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی　　غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے　　وائے اگر عہد اُستوار نہیں ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مُشکل ہے
بہ سیلِ اشک لختِ دل ہے دامنگیر مژگاں کا
غریقِ بحر جویائے خس و خاشاکِ ساحل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی
(م)　سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے!

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد   خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت   ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ   ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے
کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بیدماغ
خُوبرویوں نے بنایا غالبِؔ بدخُو مجھے

نہ ہُوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی   امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے   شوق گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی
مَے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے   ایک دن گر نہ ہُوا بزم میں ساقی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا   گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنّا نہ صِلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہُوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گُل ہونا آغوش کُشائی ہے

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اَور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اِک چشم نمائی ہے

وہ دیکھ کے حُسن اپنا مغرُور ہُوا غالب
صد جلوۂ آئینہ یک صبح جدائی ہے

سیماب پشتِ گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہُوئے ہیں دلِ بیقرار کے

آغوشِ گُل کشُودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسد
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لُطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ یار تیغِ تیزِ عُریاں ہے

ہُوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اِس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قُلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیئے　　فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیئے
ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں　　معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیئے
پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گُل　　حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیئے
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق　　اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیئے
اُس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں　　شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے
ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سُرور بخش　　پیماں سے ہم گذر گئے پیمانہ چاہیئے
جادہ ہے طرزِ گفتگوئے یار اے اسدؔ
یاں جُز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہیئے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عُریانی کرے　　صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے
میکدہ گر چشمِ مستِ یار سے پائے شکست　　مُوئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زُلف کو اُلفت کا عہد　　یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے اگر کیجے خیال　　دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں   کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر   ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں   صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں   صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے   سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو   پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے   جُوں گُلِ شمع ہو نظارہ پریشاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے   آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
اے اسدؔ! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم   کاش ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

نگہِ گرم سے اِک آگ اِپنی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
م
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطراب و شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
م　کہ بے تابی سے ہر اِک تارِ بستر خارِ بستر ہے

[1]کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ　　خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
[1]بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار　　کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
کبھی تو اِس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے　م　کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
م　مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے　　سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے
ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دَر رہنِ سخن　　تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے
یارب اِس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے　　رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

---

[1] یہ دو اشعار جو غالب کے عام نسخوں میں ملتے ہیں۔ نسخہ حمیدیہ کے صفحات ۲۲۳ اور ۲۲۴ پر مطبوعہ غیر مطبوعہ اشعار کے شائع ہوئے ہیں باقی دو اشعار نسخہ حمیدیہ میں موجود نہیں اور غالباً اس کی ترتیب کے بعد لکھے گئے۔

شومیٔ طالع سے ہُوں ذوقِ معاصی میں اسیر   نامۂ اعمال ہے تاریکیٔ کوکب مجھے
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں   آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے   کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ   نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوئے عشق بے بُنیاد   جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے
نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی   تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
اسدؔ! بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

شوخیٔ مضرابِ جولاں آبیارِ نغمہ ہے   برگ ریزِ ناخنِ مطرب بہارِ نغمہ ہے
سازِ عیشِ بیدلی ہے خانہ ویرانی مجھے   سیل یاں کوکِ صدائے آبشارِ نغمہ ہے
نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب   شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے   تا شکستِ قیمتِ دلہا صدائے خندہ ہے
عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے   دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
نقشِ عبرت در نظر یا نقدِ عشرت در بساط
دو جہاں وسعت بہ قدرِ یک فضائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
م دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست م نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

باغ تجھ بن گُلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے   چاہوں گر سیرِ چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک!   آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
میں ہوں اور حیرتِ جاوید مگر ذوقِ خیال   بہ فسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم   ہُوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے
مُدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے   آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے م سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
م
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے   بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے
یاد رکھیے ناز ہائے التفاتِ اولیں   آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جائیے
بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس   از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے
لطفِ عشق ہر یک اندازِ دگر دکھلائیگا   بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے

داد از دستِ جفائے صدمۂ ضرب المثل
گر ہمہ اُفتادگی جُوں نقشِ پا ہو جائیے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم   باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے م

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

خیمۂ لیلیٰ سیاہ و خانۂ مجنوں خراب
جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغ بیروں دادہ سے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ
دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے   نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق   گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا   آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب   اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی، سیر ہی سہی   اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مُدعی و دیدہ بنا مُدعا علیہ م
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے
پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے م
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے
برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی
کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے
فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پُوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہَوا نکلتی ہے
آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
ہے انتظار سے شررِ آبادِ رستخیز
مژگانِ کوہکن رگِ خارا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
کِس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو عندلیب
زخمِ فراق خندۂ بے جا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو   یہ محشرِ خیال کہ دُنیا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے   وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں   شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گُلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے   داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے
دلِ خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار   آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق   آئینہ بہ اندازِ گُل آغوش کُشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بُلبل قفسِ رنگ   اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
مجبوریٔ دعوائے گرفتاریٔ اُلفت   دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی   سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ   تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
بیگانگیٔ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ   کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

شُعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی   جی کس قدر افسردگیٔ دِل پہ جلا ہے
خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دِل کو   معشوقی و بے حوصلگی طُرفہ بلا ہے
ناکردہ گُناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر اِن کردہ گُناہوں کی سزا ہے

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں **اسدؔ**
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
بفراز گاہِ عبرت چہ بہار و کو تماشا
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی
بہ فراقِ رفتہ یاراں خط و حرفِ مو پریشاں
دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصہ خوانی
نہ وفا کو آبرو ہے نہ جفا تمیز جو ہے
چہ حسابِ جانفشانی چہ غرورِ دلستانی
شر و شورِ آرزو سے تب و تابِ عجز بہتر
نہ کرے اگر ہوس پر غمِ بے دلی گرانی
مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی مطلع
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
دلِ نا امید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو
جو امیدوار رہیے نہ بمرگِ ناگہانی
مجھے بادۂ طرب سے بہ خمار گاہِ قسمت
جو ملی تو تلخ کامی جو ہوئی تو سرگرانی
نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہاں تھی
مجھے طاقت آزمائی تجھے الفت آزمائی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ **غالبؔ**
کروں خوانِ گفتگو پہ دل و جاں کی میہمانی

میرے بعد

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پہ یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

نوحہ

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہُوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تُو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگُساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دُشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عُمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عُمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
شرمِ رُسوائی سے جا چھُپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دِل تس پر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسدؔ
میری دہلی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی اُلفت کا رنگ م
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

قطعہ

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا م   شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام   گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال   یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو   م   یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو   م   واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی   م   جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا   م   یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بیتابیاں   شوخیٔ بارش سے مہ فوارۂ سیلاب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ   ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا
ناگہاں اِس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا   م   دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا
شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دِل بیتاب تھا   شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
نالۂ دِل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا   تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دِل کیا نشاط آہنگ ہے   م   خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں   م   پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں   م   ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے   م   کل تلک تیرا بھی دِل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دِن کہ ہر اِک حلقہ تیرے دام کا   م   انتظارِ صید میں اِک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
م   اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

قصیدہ در منقبت

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار   سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ   ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبزہ ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ م   تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر   سینہ بیتابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل   راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم   سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز   دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال   قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی   بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار
موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ   گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر   سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ   طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا   چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور   رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

ذرّہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی اُمید کو احرامِ بہار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عُرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غُبار

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں۔ پرِ بُلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کی تیرے بہ ہوائے دیدار

تیری اَولاد کے غم میں ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

تہمتِ بے خودیِ کفر نہ کھینچے یا رب!
کمیِ ربطِ نیاز و خطِ نازِ بسیار

ہے اسیرِ ستمِ کشمکشِ دامِ دغا
دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملّت بیزار

جوہرِ دستِ دُعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سُو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دُشمنِ آلِ نبیؐ کو بطرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ عشق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ فی المنقبت

توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں   سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں
دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں م   ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
توڑے ہے نالہ سرِ رشتۂ پاسِ انفاس   سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ شغلِ تسکیں
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم   لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
یاس، تمثالِ بہار آئینۂ استغنا   وہم آئینۂ پیدائی تمثالِ یقیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم   صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلُوم   دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صُورت   سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس   وصل زنگارِ رُخِ آئینۂ حسنِ یقیں
کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب   بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
مُوجِ خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام و چہ کُفر   کجیٔ یک خطِ مسطر چہ توہم چہ یقیں!
قبلہ و ابروئے بُت یک رہِ خوابیدۂ شوق   کعبہ و بُتکدہ یک محملِ خوابِ سنگیں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز   کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں
نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیر، نہ نگاہ
گردِ جوہر ہے آئینۂ دل پردہ نشیں
شورِ اوہام سے مت ہو شبِ خونِ انصاف
گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنا نمکیں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں! کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یا علیؑ" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں
نسبتِ نام سے اسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
فیضِ خلق اسکا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرّشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں
جاں پناہا۔ دل و جاں فیض رسانا، شاہا
وصیٔ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
آستاں پر ترے ہے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیٔ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خُدا نے دیئے جان و دل و دیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں
جنسِ بازارِ معاصی اسداللہ اسدؔ
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

متفرقات

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا   خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا   غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے   کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم م   تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

ستمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر   تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیرِ وحشت کی م   ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک   گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت   نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے   لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق   نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ خُور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع　　چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ　　یعنی بغیر یک دلِ بے مُدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شُمار یاد　　مجھ سے مِرے گُنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے　　وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلُوم
بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر　　متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلُوم
اسدؔ فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا　　وگرنہ دلبریٔ وعدۂ وفا معلُوم

دَیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا　　واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
مست مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں م　　ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا　　تعجب سے وہ بولا "یُوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"
دلِ نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ　　نہ کر سرگرم اِس کافر کو اُلفت آزمانے میں

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیئے　　کھُل گئی مانندِ گُل سَو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعوئ وارستگی　　سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز   دلے بہ دستِ نگارے نہ دادہ رکھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ **اسد**
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دِل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا م بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں
ہے مری وحشت عدوئے اعتباراتِ جہاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام } مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ   طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی   دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے م میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ گشتہ ہے   نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ گشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں م ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ گشتہ ہے

تغافل دوست ہوں ۔ میرا دماغِ عجز خالی ہے   اگر پہلو تہی کیجے ۔ تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے   غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ   اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے   آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اَے آگہی رنگِ تماشا باختن   چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

غم و عشرت قدمبوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے   دعائے مُدعا گُم کردگانِ عشق "آمیں" ہے
لبِ عیسےٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی   قیامت کشتۂ لعلِ بُتاں کا خوابِ سنگیں ہے

رُباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال   ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم   اَے عمرِ گذشتہ ایک قدم استقبال

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا   کیا شرح کروں کہ طُرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک   ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُر نم تھا

دِل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی   بے تابیٔ رشک وحسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اَے تجلی افسوس!   تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے   وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صُورتِ کاغذِ باد   ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ   ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خوں و دعوتِ صد نشتر   یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دِل   سُن سن کے اِسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گوئم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اِلتجا

یا علیؓ دانی کہ روئم سوئے تست از ہر نورد م   ہر چہ آغازم مخاطب دائمت در ہر خطاب
موئے آتش دیدہ را مانم کہ بہرِ خویشتن م   حلقۂ دامِ فنا گردیدہ ام از پیچ و تاب
غافل از رفتارِ عمر و فارغ از تکمیلِ عشق   کردہ آغوشِ وداعِ دل نشیمن گاہِ خواب
نقدِ آگاہی بوہمِ فرصتے در باختہ   دستِ خالی بر سرِ دل پائمالِ اضطراب
خود تو میدانی کہ کم گردیدہ دشتِ اُمید   تشنہ تر مے گردد از بے آبی موجِ سراب
دل ز کار اُفتاد۔ و پا واماند و دست ایں ستم ہم شکست   قطعِ منزل کے تواں کردن بدیں حالِ خراب
مدعا را بر زباں آوردن از بیگانگی ست   جز نگاہت شاہدِ مارا کفن بادا نقاب
ذوقِ مطلب از تو۔ و من از تو و مطلب ز تو   خود تو می بخشی و می فہمی زبانِ اضطراب
شعلہ شوقے ہوس دارم ز سودائے جنوں   کآتشِ افسردہ را بخشد بہارِ التہاب
دین و دُنیا را بلاگردانِ نازت کردہ ام   جلوۂ رنگیں ترا از صد گلشنِ خُلد انتخاب

حرمتِ جانِ محمدؐ یک نظر کن سوئے من
یا علیؓ یا مرتضٰیؓ یا ابوالحسنؓ یا ابوترابؓ

خمخانۂ شباب

سنہ ۱۸۲۱ء تا سنہ ۱۸۲۷ء

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غزلیات

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا   اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نُسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دِل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خُوں ہے اب   اِس رہگذر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟   دل بھی اگر گیا تو وُہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بے خُودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بے دادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اِک قطرۂ خُوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہُوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مُضمر ہے اِک صُورت خرابی کی
ہیولے برقِ خرمن کا ہے خُونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ۔ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہُوں مَیں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اِک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حُجرہ ہے یُوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا؟
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہُوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا ۱۸۲۷ء

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ، بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز!
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا
تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہُوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا،
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی!
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟   کہاں تک اے سراپا ناز "کیا کیا؟"
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں   شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں   تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے   ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے   تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے   غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے؟ میں ضامن ادھر دیکھ   شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن!   شکستِ قیمتِ دِل کی صدا کیا
کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ؟   شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟   یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا
بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا ادا کیا   ۱۸۲۷؟

دِل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ق   آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دِل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں   آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
مَیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں   کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار   اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
مَیں ہُوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دِل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ق   جس دِل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل نہیں رہا
بر رُوئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے ق   یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بے دادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہو کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ! اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کا کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس؟ کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا؟
تا کہ تجھ پہ کھلے اعجازِ ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

جاتا ہُوں جِدھر سب کی اُٹھے ہے اُدھر اُنگشت
ق یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت
گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں!
ق ہے شمع شہادت کے لئے سر بسر انگشت
شوخی تیری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا
رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت
کِس رُتبے میں باریکی و نرمی ہے کہ جُوں گُل
آتی نہیں پنجے میں بس اس کے نظر انگشت
افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گُہر انگشت
کافی ہے نشانی تِری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہُوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مِرے حرف پر انگشت

* * *

آمدِ خط سے ہُوا ہے سرد جو بازارِ دوست
ق دُودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

برقِ خرمن زارِ گوہر ہے نگاہِ تیز یاں
ق اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیٔ رفتارِ دوست
ہے سوا نیزے پہ اُس کے قامتِ نوخیز سے
ق آفتابِ صبحِ محشر ہے گُلِ رُخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یُوں کرتا ہے پرسش مجھ سے اسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تاکہ مَیں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک
مُجھکو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جبکہ مَیں کرتا ہُوں اپنا شکوۂ ضُعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

* * *

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب
لکھے ہے "خداوندِ نعمت سلامت"
دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت
علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ گردوں
جگر چاہیئے جوشِ حسرت سلامت
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت
نہ اوروں کی سنتا نہ کہتا ہوں اپنی
سرِ خستہ دشوارِ وحشت سلامت
وفورِ بلا ہے ہجومِ وفا ہے
سلامت ملامت ملامت سلامت
نہ فکرِ سلامت نہ بیمِ ملامت
زخود رفتگی ہائے حیرت سلامت
رہے غالبؔ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ق
ہوں گل فروشِ شوخئ داغِ کہن ہنوز
فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

مےخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

کب فقیروں کو رسائی بتِ مےخوار کے پاس
تونبے بو دیجئے میخانے کی دیوار کے پاس
مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہُوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
مَیں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
آزادئ نسیم مُبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں رہ گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

* * *

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دِل ق ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا گر اِک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
مَیں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تُو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خُدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہُوا ہے تارِ اشک یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
ہُوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
ق کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہُوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خُوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنُوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
ہُوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
ق اسدؔ زندانیٔ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبۂ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اِک بہارِ ناز کے مارے ہُوئے
جلوۂ گُل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ اِک ہیولے ہے نئے ناسُور کا
خُوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
مَوجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمُو
قد کے جُھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف ہُوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں
۱۸۲۷ء

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجُود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشُوق نہ رُسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

* * *

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
مَیں جو کہتا ہوں "کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
پیٹھ محراب کی قبلہ کی طرف رہتی ہے
محوِ نسبت ہیں تکلف ہمیں منظور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں ۱۸۲۷؟

* * *

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب!
ہم کو تسلیمِ نکونامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں۔ پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئِ اُستاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بداحالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مُرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اسکو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں ۱۸۲۷ء

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
دِل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں
بے عشق عُمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دِل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہائے زار سے میرے۔ خدا کو مان
آخر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں

دِل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی   حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو۔ جگر میں خاک نہیں
مگر غُبار ہُوئے پر ہَوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گُل رہگذر میں خاک نہیں
بھلا اسے نہ سہی۔ کچھ مُجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہُوا ہُوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

* * *

وارستہ اُس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے۔ وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

* * *

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

دل کو مَیں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں نالۂ مُرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"
دِل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا یعنی ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو! ۱۸۲۷ء

بہ سختی ہائے قیدِ زندگی معلوم آزادی ق شررِ در بندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے
اسدؔ یاسِ تمنا سے نہ رکھ اُمیدِ آزادی ق گدازِ آرزوہا آبیارِ آرزوہا ہے
مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی۔ ورنہ اے ہمدم! اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
ق بے ستوں خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے
ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیرِ نگاہ
ق پردۂ بادام یک غربالِ حسرت بیز ہے
ہے بہارِ تیز رو گلگونِ نکہت پر سوار
یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے
کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو؟
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے
ق عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

* * *

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے   بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر   آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے
دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی   ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری   تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے
نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

عشق مجھ کو نہیں۔ وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے **اسدؔ**
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
مَیں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دِل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بُردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

پھر کچھ اِک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وُہی پردۂ عماری ہے
چشمِ دلّالِ جنسِ رُسوائی!
دِل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے
دِل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پُوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ ری تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال ۔ نہ نظارۂ جمال   مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم   ہر موجِ گردِ راہ میرے سر کو دوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب   اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا   کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست   بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل   ق   زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو   میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی   مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط   دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ   یہ جنتِ نگاہ ۔ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں   نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے   ۱۸۲۷ء

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ اُلفت
فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
خُدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عُمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تُمہارے آئیو اَے طُرّہ ہائے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہُوئے تھے اس کو دم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

* * *

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری   اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خُوں ریز نہ پُوچھ!   دیکھ خُوں نابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار   مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال   بھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے مقابل میرا   رک گیا دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری
گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں   صرصرِ شوق ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا   کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری   ۱۸۲۷ء

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور   دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے   یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو   خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے   یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دِل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دُشمنی نے میری کھویا غیر کو
کِس قدر دُشمن ہے دیکھا چاہیے
اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے
غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خُوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صُورت کو دیکھا چاہیے

* * *

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دِل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جُنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ق
کہا جو اُس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے" ١٨٢٦ء

* * *

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تُونبے گر باغ گدائے مے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اَے "نہیں ہے"

* * *

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سُرمہ تو کہوے کہ دُودِ شعلہ آواز ہے
پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دست گاہِ دیدۂ خُوں بارِ مجنُوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گُل فرشِ پا انداز ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مُجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہُوں اور کھنچتا جائے ہے مُجھ سے
وہ بد خُو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر۔ قاصد بھی گھبرا جائے ہے مُجھ سے
ادھر وہ بدگمانی ہے۔ ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پُوچھا جائے ہے مُجھ سے نہ بولا جائے ہے مُجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مُجھ سے
تکلف برطرف! نظارگی میں بھی سہی۔ لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مُجھ سے
ہُوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مُجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مُدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مُجھ سے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب   غرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیئے ہُوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال   صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیئے ہُوئے
پھر چاہتا ہُوں نامۂ دلدار کھولنا   جاں نذرِ دلفریبیٔ عُنواں کیئے ہُوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس   زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیئے ہُوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مُقابل میں آرزُو   سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیئے ہُوئے
اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغِ مے سے گُلستاں کیئے ہُوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں   سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیئے ہُوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وُہی فُرصت کہ رات دن   بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیئے ہُوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیئے ہُوئے

مُتفرقات[۱]

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ   یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

---

[۱] افسوس ہے کہ ان متفرق اشعار کے مُتعلق ہم تصدیق نہیں کر سکے کہ وہ ۱۸۲۷ء سے پہلے یا بعد میں لکھے گئے۔

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں   اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہائے زُلف کمیں میں ہیں اے خُدا!   رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر   عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں مَیں ہُوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں۔ ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

پینس میں گزرتے ہیں جو کُوچے سے وہ میرے   کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

* * *

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

* * *

ہوں مَیں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

رُباعیات[1]

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا مُوجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

* * *

---

[1] نسخۂ شیرانی کے اخیر کے چند صفحات غائب ہیں۔ اور قرینِ قیاس ہے کہ اُن میں قطعات اور رُباعیات ہوں گی۔ اُن صفحات کی کمی کی وجہ سے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ خمخانۂ شباب کی کونسی رُباعیاں نسخۂ شیرانی کی کتابت کے وقت بھی جا چکی تھیں۔

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا　اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں　غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب　دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

بہارِ عجم

ا - لالۂ صحرا
ب - گلِ رعنا } ۱۸۲۷ تا ۱۸۳۸
ج - بادۂ شیراز ۱۸۳۸ تا ۱۸۴۷
د - گلبنِ ہندی ۱۸۲۷ تا ۱۸۴۷

کشد چہ رنج سخنور کہ نقشہائے بدیع   زبہرِ آنکہ گزارد بہ یادگار کشد
خجستہ طالع دستے کہ بے توقعِ مزد   زپائے رہروِ آزردہ پائے خار کشد
نیاز مند مباد آں بزرگِ کوچک دل   کہ ناز راہ نشینانِ خاکسار کشد۔
کفش بہ کوچہ و بازار زر فشاں باید   بخانہ آنکہ سراپردہ زرنگار کشد

لالۂ صحرا[1]

غزلیات

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا   سرِ تارِ نظر شد رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
بروئے برگِ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری   بہار از حسرتِ فرصت بدنداں میگزد لبہا
بخلوت خانۂ کامم نہنگِ "لا" زدم خود را   ستوہ آمد دل از ہنگامۂ غوغائے مطلبہا
کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہائے ما گردوں   نیاید خشتِ مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا
خوشا بے رنگیِ دل دستگاہِ شوق را نازم   نمی بالد بخویش ایں قطرہ از طوفانِ مشربہا
ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت   بود تہ بندیٔ خطِ سبزۂ خط در تہِ لب ہا
خوشا رندی و جوشِ زندہ رودِ مشربِ عندلیبش   بہ لب خشکی چہ میری در سرِ البستانِ مذہبہا

---

[1] اس عنوان کے تحت جو غزلیات وغیرہ درج ہیں۔ وہ سوائے پہلی غزل کے سب سفرِ کلکتہ کی یادگار ہیں۔ اور پہلی غزل بھی زبان اور خیالات کے لحاظ سے اس زمانے کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

تو خوی پنداری و دانی کہ جاں بردم نمیدانی
کہ آتش در نہادم آب شد از گرمئے تبہا
مبادا ہمچو تارِ سبحہ از ہم بگسلد غالبؔ
نفس با ایں ضعیفی برنتابد شورِ یارب ہا

* * *

بر نمی آید ز چشم از جوشِ حیرانی مرا
شد نگہ زنّارِ تسبیحِ سلیمانی مرا
دامن افشاندم بجیب ماندہ در بندِ تنم
وحشتے کو تا بروں آرد ز عریانی مرا
وہ! کہ پیش از من بپابوسِ کسے خواہد رسید
سجدۂ شوقے کہ می بالد بہ پیشانی مرا
با ہمہ خرسندی از وے شکوہ ہا دارم ہمی
تا ندانند صیدِ پرسشہائے پنہانی مرا
تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا
با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالبؔ نیست آہنگِ غزلخوانی مرا (کلکتہ)

* * *

تا کیم دودِ شکایت ز بیاں برخیزد
بزن آتش کہ شنیدن ز میاں برخیزد
می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو
بے محابا شو و بنشیں کہ گماں برخیزد
گر دہم شرحِ عتابے کہ بدلہا داری
دود از کارگہِ شیشہ گراں برخیزد
با قدت سرو چو تشخیص کند ناگہ یکبار
بے خود از جا ز ہجومِ خفقاں برخیزد
بچہ گیرند عیارِ ہوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مباد از جہاں برخیزد

کشتۂ دعویٔ پیدائی خویشیم ہمہ   وائے گر پردہ ازیں رازِ نہاں برخیزد
زینہار از تعبِ دوزخِ جاوید مترس   خوش بہاریست کزو بیمِ خزاں برخیزد
جُزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم   ہمچو مُوئے کہ بُتاں را ز میاں برخیزد
عُمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ   چُوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد
گر دہم شرحِ ستمہائے عزیزاں غالبؔ
رسمِ اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد   (کلکتہ)

* * *

شبہائے غم کہ چہرہ بہ خُوناب شُستہ ایم
از دیدہ نقش وسوسۂ خواب شُستہ ایم
افسونِ گریہ بُرد ز خوبیت عتاب را
از شعلۂ تو دُود بہ تفت آب شُستہ ایم
زاہد خوش است صُحبت از آلودگی مترس
کایں خرقہ بارہا بہ مئے ناب شُستہ ایم
اے در عتاب رفتہ ز بے رنگیٔ سرشک
غافل کہ امشب از مژہ خُوناب شُستہ ایم
پیمانہ را ز بادہ بہ خوں پاک کردہ ایم
کاشانہ را ز رخت بسیلاب شُستہ ایم

غرقِ محیطِ وحدتِ صرفیم و در نظر
از روئے بحر موجہ و گرداب شستہ ایم
بے دست و پا بہ بحرِ توکّل فتادہ ایم
از خویش گردِ زحمتِ اسباب شستہ ایم
در مسلخِ وفا ز حیا آب گشتہ ایم
خوں از جبیں و دست ز قصاب شستہ ایم
غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے
از سینہ داغِ دوریِ احباب شستہ ایم

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
ایماں بہ غیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
ز اسما گزشتہ ایم و مسمّٰے نوشتہ ایم
قلزم فشانیِ مژہ از پہلوئے دلست
ایں ابر را برات بدریا نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیِ لفظِ امید نیست
فرہنگ نامہ ہائے تمنّا نوشتہ ایم
آئندہ و گزشتہ تمنّا و حسرت است
یک "کاشکے" بود کہ بصد جا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم
کوبیت ز نقشِ جبہۂ ما یک قلم بریست
لختے سپاسِ ہمدمیِ پا نوشتہ ایم
غالب الف ہماں علمِ وحدتِ خود است
بر لا چہ بر فزود گر الّا نوشتہ ایم (کلکتہ)

قصیدہ در منقبت

نازم بہ گرانمایگیِ دل کہ ز سودا   ہر قطرۂ خوں یافتہ پروازِ سویدا
اجزائے وجودم ز گدازے کہ ز جاں یافت   پالود بداں شیوہ کہ دل گشت سراپا
در جیبِ رفیقاں گلِ شاداب فشاندم   ہر چند تفِ تشنگیم سوخت بہ صحرا
در بزمِ حریفاں رگِ مہتاب کشودم   گر خود گردوں نمکم ریخت بہ صہبا
نفریں نزند سیلیِ صرصر بچراغم   تحسین نہ دماند ز رگِ سازِ من آوا
از بسکہ سیہ مستِ مئے جنبشِ کلکم   در پردۂ ہر نقش دلم میرود از جا
بے راہ اگر گام زنم خردہ مگیرید   در عربدہ راہم زدہ رازیست بہ پنہا
نظارۂ خوباں و مے و نغمہ حرامست   دیدیم و شنیدیم سَمِعنَا وَ اَطَعنَا
با ایں ہمہ ہر جا کند آہنگ خرابی   سرگرمیِ شوقے کہ بود حوصلہ فرسا
با نغمۂ مطرب نتواں شد متعصب   از جلوۂ ساقی نتواں کرد تبرا
شوقست کہ چوں نشاۂ توحید رساند   از دار برد پایۂ منصور ببالا
شوقست کہ فرہاد ازو مردہ بہ سختی   شوقست کہ مجنوں شد ازو بادیہ پیما
شوقست کہ مرآت مرا دادہ بہ صیقل   شوقست کزو طوطیِ طبعم شدہ گویا
شوقست کز اعجازِ اثرہائے قبولش   آئینہ پیدائی حرفست ورقہا

قانع بہ سخن نیستم و باک ندارم   نہ خویش سپاس ست و نہ از غیر محابا
نظارگیِ جلوۂ اسرارِ خیالم   در آئینۂ چشمِ حسود و دلِ اعدا
ز آویزشِ دوناں ز سخن باز نمانم   سیلاب مرا زیں خس و خاشاک چہ پروا
شوقم ہمہ رازست، من و عربدہ ہرگز
سوزم ہمہ سازست، من و شکوہ مبادا

۱۵

گر مہر و گر کیں ہمہ رعنائیِ وہم ست   شاد آنکہ بہ نیرنگ نہ گردید فریبا
اندیشہ دو صد گلکدہ گل بردہ بدامن   آما ہمہ از نقش و نگارِ پرِ عنقا
آں وعظ فقیہانہ ز زاہد کہ نہ زیبد   بر صفحۂ دیں نقشِ رواجِ غمِ دنیا
واں نغمۂ مستانہ ز رنداں کہ نیرزد   دم سردیِ امروز بسر گرمیِ فردا
آں حسن و دمِ ناز ز افسونِ ادائے   جاں باندمیدن بہ تنِ صورتِ دیبا
واں عشق و گہ عجز بہ امید نگاہے   از خویش گزشتن بسرِ راہ تمنا
گردیدنِ ہفت اختر و نہ چرخ بہر سو   زیں عربدہ بالیدن آثار بہر جا
گل کردنِ صد رنگ بہار از جگرِ خاک   برجستنِ یکدستہ شرار از رگِ خارا
ہنگامۂ ابلیس نشاں دادنِ گندم   افسانۂ آوارگیٔ آدم و حوا

دانستہ شود ہر چہ ز اسرارِ تعیّن   سنجیدہ شود ہر چہ ز آثارِ من و ما
از خامۂ نقاش بروں نامدہ ہرگز   ہر نقش کہ بینی ز پسِ پردہ ہویدا
وحدت ہمہ جا نسبتِ معین کہ خود از وے   ہستی ہمہ جز نیست حقیقی کہ مر اُو را
طرفے نتواں بست بسرگرمیِ اوہام   ہرگز نتواں کرد بپراگندہ براجزا
آئینہ بہ پیشِ نظر و جلوہ فراواں   دِل پُر ہوس و صاحبِ خلوتکدہ تنہا
پیدا و نہاں مشغلۂ حُبِّ ظہور ست   چُوں پردہ براُفگند نہ نہانست نہ پیدا

صُبحِ بنارس

تعالیٰ اللہ بنارس چشمِ بد دُور   بہشتِ خُرّم و فردوسِ معمُور
تناسخ مشرباں چوں لب کُشایند   بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد   دگر پیوندِ جسمانی نگیرد
زہے آسودگی بخشِ روانہا   کہ داغِ چشم می شوید ز جانہا
شگفتے نیست از آب و ہوایش   کہ تنہا جاں شود اندر فضایش
بیا اے غافل از کیفیتِ ناز   نگاہے بر پری زادانش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کُن تماشا   ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہادِ شاں چو بُوئے گُل گراں نیست   ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست

خس و خارش گلستانست گوئی　　غبارش جوہرِ جانست گوئی
سوادش پائے تختِ بُت پرستاں　　سراپایش زیارت گاہِ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیاں ست　　ہمانا کعبۂ ہندوستانست
بُتانش را ہیولائے شعلۂ طُور　　سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دُور
میاں ہا نازک و دِل ہا توانا　　ز نادانی بکارِ خویش دانا
تبسّم بسکہ در لبہا طبیعیست　　دہن ہا رشکِ گلہائے ربیعیست
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار　　خرامے صد قیامت فتنہ دربار
بہ لُطف از موجِ گوہر نرم روتر　　بناز از خونِ عاشق گرم روتر
ز انگیزِ قد انداز خرامے　　بپائے گلبنے گسترده دامے
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش　　بہارِ بستر و نوروز آغوش
ز تابِ جلوۂ خویش آتش افروز　　بتانِ بُت پرست و برہمن سوز
بسامانِ دو عالم گلستاں رنگ　　ز تابِ رُخ چراغانِ لبِ گنگ
قیامت قامتانِ مژگاں درازاں　　ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں
بہ تن سرمایۂ افزائشِ دِل　　سراپا مژدۂ آسائشِ دل
بہ مستی موج را فرمودہ آرام　　ز نغزی آب را بخشیدہ اندام
فتادہ شورشے در قالبِ آب　　ز ماہی صد دلش در سینہ بیتاب
ز بس عرضِ تمنا میکند گنگ　　ز موج آغوشہا وا میکند گنگ

ز تابِ جلوہ ہا بیتاب گشتہ
گہر ہا در صدف ہا آب گشتہ

بادِ مخالف

اے تماشائیانِ بزمِ سخن!   وے مسیحا دمانِ نادرِ فن
اے سخن پرورانِ کلکتہ   وے زباں آورانِ کلکتہ
اسد اللہ بخت برگشتہ   در خم و پیچ عجز سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست   بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست
بہ تظلّم رسیدہ است اینجا   بامید آرمیدہ است اینجا
کارِ احباب ساختن رسم ست   میہماں را نواختن رسم است
آں رہ و رسمِ کارسازی کو   شیوۂ میہماں نوازی کو
کیستم دلِ شکستہ غم زدۂ   بے دلے خستۂ ستم زدۂ
برق بے طاقتی بجاں زدۂ   آتشِ غم بخان و ماں زدۂ
از گدازِ نفس بتاب تبے   در بیابانِ یاس تشنہ لبے
خسِ طوفانے از محیطِ بلا   سر بسر گردِ کاروانِ فنا
دردمندے جگر گداختۂ   از غمِ دہر زہرہ باختۂ

در آگاہیِ فنا زدۂ   ہمہ بر خویش پشتِ پا زدۂ
چہ بلاہا کشیدہ ام آخر   کہ بدینجا رسیدہ ام آخر
بسیہ روزِ غربتم ببینید   تیرہ شبہائے وحشتم ببینید
اندہِ دوریٔ وطن نگرید   غمِ ہجرانِ انجمن نگرید
نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم   من و جاں آفریں کہ جاں بلبم
من کہ و عزمِ داوری کردن   سازِ بزمِ سخنوری کردن
با بزرگاں نیازہا دارم   ہم بدیں شیوہ نازہا دارم
بندہ ام بندہ مہربانان را   رمز فہمان و نکتہ دانان را
نہ ز آویزشِ بیاں ترسم   من و ایمانِ من کزاں ترسم
کہ پس از من بسالہائے دراز   بزباں ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود اینجا   چند روز آرمیدہ بود اینجا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت   زحمتے داد و راہِ خویش گرفت
شوخ چشمے و زشت خوئے بود   بے حیائے و ہرزہ گوئے بود
برگِ دنیا نہ سازِ دینش بود   ننگِ دہلی و سرزمینش بود
آہ ازاں دم کہ بعدِ رفتنِ من   خونِ دہلی بود بگردنِ من
تابِ ہنگامہ ام خدارا نیست   مہربانان دلست خارا نیست
ویں کہ در پیشگاہِ بزمِ سخن   بزبانہا فتادہ است زمن

کہ فلاں با قتیلؔ نیکو نیست　　مگسِ خوانِ نعمتِ او نیست
زلّہ بردارِ کس چرا باشم
من ہمایم مگس چرا باشم؟

فریاد

نہ مرا دولتِ دنیا، نہ مرا اجرِ جمیل　　نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل
با رقیباں کفِ ساقی بمئے ناب کریم　　با غریباں لبِ جیحوں بدمے آب بخیل
اے بہ مسمارِ قضا دوختہ چشمِ ابلیس　　بدمِ گرم رواں، سوختہ بالِ جبریلؑ
با توام خرّمئ خاطرِ موسےٰ بر طور　　با خودم خستگیٔ لشکرِ فرعون بہ نیل
بر کمالِ تو در اندازہ کمالِ تو محیط　　بر وجودِ تو در اندیشہ وجودِ تو دلیل
نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را　　اے بترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل!
غالبؔ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری
بدیارے کہ ندانند نظیریؔ ز قتیلؔ!

تشبیبِ قصیدہ

تو اے ستارہ ندانی کہ رنجم از آزار — تو اے سپہر نسنجی کہ ترسم از بیداد
ترا غمیست بسرمایۂ گرانیٔ کوہ — مرا دلیست بہ نیروئے تیشۂ فرہاد
من و بلائے تو نطعِ ادیم و تابِ سہیل — من و جفائے تو شاگرد و سیلیٔ اُستاد
من و ستم دلِ رنجور و التفاتِ طبیب — من و خطر رگِ مجنوں و نشترِ فصّاد
بگوشِ تابِ طبیعت رسم معاذ اللہ — ندیدہ ام کہ خود از کیست جملہ بست و گشاد
ستارہ را ہمہ رفتار ز اقتضائے قضا است — چنانچہ جنبشِ نرد از اناملِ نراد
فلک کجائی و طالع چہ و ستارہ کدام — کنم شکایتِ دشمن ز دوست شرمم باد
غزل سرایم و درہم بپیچم از اندوہ — ترانہ سنجم و برخیزم از سرِ فریاد
بیا کہ شوق عنانِ سخن بگرداند — ز سنگلاخِ شکایت بہ مرغزارِ وداد
بیا کہ نیست ثباتے بدیں نشاط و ملال — بیا کہ نیست دوامے بدیں بیاض و سواد
بیا کہ زود سر آید زمانۂ اندوہ — شود روانِ گرامی ز بندِ تن آزاد

بیا کہ دادہ نویدِ نکوئیٔ فرجام
حسینؑ ابنِ علیؓ آبروئے دانش و داد!

شبابِ غالبؔ

آں بلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار
بود آشیانِ من شکنِ طرّۂ بہار
آں مطربم کہ سازِ نوائے خیالِ من
غیر از کمندِ جاذبۂ دِل نداشت تار
آں ریشۂ نگاہِ امیدم کہ دمبدم
بُود از نمِ طراوتِ دل شوقم آبیار
ہر غنچہ از دمم بتقاضائے شگفتگی
فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار
ہر جلوہ راز من بتقاضائے دِلبری
از غنچہ بود محمل نازے برہگزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ دِلبراں
فرہنگِ کاروانیٔ بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہداں
فہرستِ روزنامۂ اندوہِ انتظار
شوقم جریدۂ رقمِ آرزوئے بوس
ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار
فکرم بجیبِ شاہدِ اندیشہ گلفشاں
کِلکم بطرفِ گلشنِ نظّارہ لالہ کار
از چشم و دل نہادِ مرا بود تاج و تخت
وز رنگ و بُو بساطِ مرا بُود پود و تار
بختم بجیبِ عشرتیاں میفشاند گل
سعیم زپائے محنتیاں میکشید خار
وقتِ مرا روانئے کوثر در آستیں
بزمِ مرا طراوتِ فردوس در کنار
ساقی ز بادہ برِ اثرِ نغمہ عُذر خواہ
مُطرب ز نغمہ در ہوسِ بادہ حق گزار

از پردہ ہاے ساز نفسہا اثر فشاں   وز جلوہ ہاے ناز نظرہا کرشمہ بار
ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرود و سوز   پیوستہ شعر و شاہد و شمع و دمے و قمار
با کیسہ در خصومت و با کاسہ در لجاج   رندانِ پاکباز و شگرفانِ شادخوار
بہ مستئ شبینہ و خوابِ سحرگہی   رنگینئ سفینہ و اشعارِ آبدار
اکنوں منم کہ رنگ برویم نمے رسد   تا رُخ بخونِ دیدہ بشوئم ہزار بار

چشمم کشودہ اند بکردارہاے من
زایندہ نا اُمیدم و از رفتہ شرمسار

گلِ رعنا

غزلیات

خیز و بیراہہ روے را سرِ راہے دریاب
شورش افزا نگہِ حوصلہ گاہے دریاب

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تابِ اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است
خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب

غمِ افسردگیم سوخت کجائی اے شوق
نفسم را بہ پرافشانیِ آہے دریاب

تا چہا آئینۂ حسرتِ دیدارِ تو ایم
جلوہ بر خود کن و ما را بہ نگاہے دریاب

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شدہ
تشنہ بے دلو و رسن بر سرِ چاہے دریاب

داغِ ناکامیِ حسرت بود آئینۂ وصل
شبِ روشن طلبی روزِ سیاہے دریاب

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبحِ بہاری شبِ ماہے دریاب

غالب و کشمکشِ بیم و امیدش ہیہات
یا بہ تیغے بکش و یا بہ نگاہے دریاب

سحر دمیدہ و گل در دمیدنیست مخسپ
جہاں جہاں گُلِ نظارہ چیدنیست مخسپ
مشام را بہ شمیمِ گلے نوازش کُن
نسیمِ غالیہ سا در وزیدنیست مخسپ
زخویش حسن طلب بیں در صبوحی کوش
مے شبانہ زلب در چکیدنیست مخسپ
ستارۂ سحری مژدہ سنجِ دیداریست
ببیں کہ چشمِ فلک در پریدنیست مخسپ
تو محوِ خواب و سحر در تأسف از انجم
بہ پشتِ دست بدنداں گزیدنیست مخسپ
نفس ز نالہ بہ سنبل درودنیست بخیز
زخونِ دل مژہ در لالہ چیدنیست مخسپ
نشاط گوش زآوازِ قلقل است، بیا
پیالہ چشم براہِ کشیدنیست مخسپ
نشانِ زندگیِ دل دویدنیست، مایست
جلائے آئینۂ چشم دیدنیست، مخسپ
زدیدہ سوِ حریفاں کشودنیست مبند
زدل مرادِ عزیزاں تپیدنیست، مخسپ
بذکرِ مرگ شبے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانہ غالبؔ شنیدنیست مخسپ

ظہورِ بخششِ حق را ذریعہ بے سببی ست
وگرنہ شرمِ گُنہ در شمارِ بے ادبی ست
زگیر و دار چہ غم، چُوں بعالمے کہ منم
ہنوز قصۂ حلاج حرفِ زیرلبی ست
رموزِ دیں نشناسم درست، و معذُورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست
نشاطِ جم طلب از آسماں، نہ شوکتِ جم
قدح مباش ز یاقوت، بادہ گر عنبی ست
بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی ست
نہ ہم پیالگئے زاہداں بلائے بُود؟
خُوشست گر مے بخشش خلافِ شرعِ نبی ست

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست   عیارِ بیکسیِ ما شرافتِ نسبی ست
کسیکہ از تو فریبِ وفا خورد داند   کہ بے وفائیِ گُل در شمارِ بوالعجبی ست
عبودیت نکند اقتضاے خواہشِ کارم   دُعا بصیغۂ امر است و امرِ بے ادبی ست
میانِ غالبؔ و واعظ نزاع شد ساقی
بیا بہ لابۂ کہ ہیجان قوتِ غضبی ست

آ ہے بعشقِ فاتحِ خیبر کُنیم طرح   در گنبدِ سپہر مگر در کنیم طرح
در فصلِ مے کہ گشتہ جہاں زہرہ را زدو   بنشیں کہ آبِ گردشِ ساغر کنیم طرح
تا چند بشنوی تو و ما حسبِ حالِ خویش   افسانہ ہائے غیرِ مکرّر کنیم طرح
ما را زبوں مگیر گر از پا در آمدیم   از ما عجب مدار گر از سر کنیم طرح
خود را بشاہدی بپرستیم زیں سپس   در راہِ عشق جادۂ دیگر کنیم طرح
از داغِ شوقِ پردہ نشینے نشان دہیم   در زخمِ رشک روزنۂ در کنیم طرح
از تار و پودِ نالہ نقابے دہیم ساز   وز دودِ سینہ زلفِ معنبر کنیم طرح
برگِ حنا ز شعلہ و آذر بہم نہیم   پیرایہ از شرارہ و اخگر کنیم طرح
از زخم و داغ لالہ و گل در نظر کشیم   از کوہ و دشت حجلہ و منظر کنیم طرح
از سوز و ساز محرم و مطرب کنیم جمع   از خار و خارہ بالش و بستر کنیم طرح
آئینِ برہمن بہ نہایت رسانده ایم
غالبؔ بیا کہ شیوۂ آزر کنیم طرح

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رُخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند
دل ربُودند و دو چشمِ نگرانم دادند
سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند
بعوضِ خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بُردند
بہ سخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند
گوہر از تاج گُسستند و بدانش بستند
ہر چہ بُردند بہ پیدا بہ نہانم دادند
ہر چہ در جزیہ ز گبراں مئے ناب آوردند
بشبِ جمعۂ ماہ رمضانم دادند
ہر چہ از دستگۂ پارس بہ یغما بُردند
تا بنالم ہم ازاں جُملہ زبانم دادند
دِل ز غم مُردہ و من زندہ۔ ہمانا ایں مرگ
بود ار زندہ بماتم کہ امانم دادند
ہم ز آغاز بخوف و خطر ستم غالبؔ
طالع از قوس و شمار از سرطانم دادند

عاشق چہ گفتیش کہ بدر زود میرود
نازم بخواجگی بغضب آلود مے رود
از نالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار
شمعِ خموشم و ز سرم دُود مے رود
شادم بہ بزمِ وعظ کہ رامش اگرچہ نیست
بارے حدیثِ چنگ و نے و عُود میرود
فردوس جوئے عمر بوسواس دادہ ما
سرمایہ نیز در ہوسِ سُود میرود
ماہم بہ لاغ دلا بہ تسلی نشویم کاش
ناداں ز بزمِ دوست چہ خوشنود میرود
رشکِ وفا نگر کہ بدعوئے گہِ رضا
ہر کس چگونہ در پئے مقصود میرود

فرزند زیرِ تیغِ پدر مے نہد گلو   گر خود پدر در آتشِ نمرود میرود
غالب خُوشست فرصتِ ہجوم و فکرِ عیش
تارے کہ نیست در سرِ ایں پود میرود

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جاں نبود   بریدہ باد زبانے کہ خُونچکاں نہ بود
حکیم ساقی و مے تُند و من ز بدخوئی   ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نہ بود
نگفتہ ام ستم از جانبِ خداست ولے   خدا بہ عہدِ تو بر خلق مہرباں نہ بود
زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوقست   بسوئے قیس گرائش ز سارباں نہ بود
مرا کہ لب بطلب آشنا نخواستہ   روا مدار کہ شاہدِ ضمیر داں نہ بود
بالتفاتِ نگارم چہ جائے تہنیت ست   دُعا کنید کہ نوعے ز امتحاں نہ بود
عجب بود سرِ ہمخوابئ کسے غالب
مرا کہ بالش و بسترِ ز پرنیاں نہ بود

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر   چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر
ز من بجرمِ تپیدن کنارہ می کردی   بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم   ندیدنِ تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد   در انتظارِ ہما، دام چیدنم بنگر
نیاز مندیِ حسرت کشاں نمیدانی   نگاہ من شو و دُزدیدہ دیدنم بنگر
بداد من نہ رسیدی ز درد جاں دادم   بدادِ طرزِ تغافل رسیدنم بنگر

تواضعے نہ کنم بے تواضعے غالبؔ
بسایۂ خمِ تیغش خمیدنم بنگر

یارب ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز   صد بادیہ در قالبِ دیوار و درم ریز
از مہرِ جہاں تاب امیدِ نظرم نیست   ایں تشتِ پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز
دل را ز غمِ گریۂ بے رنگ بجوش آر   اجزائے جگر حل کن و در چشمِ ترم ریز
ہر برق کہ نظّارہ گداز ست نہادش   بگداز و بہ پیمانۂ ذوقِ نظرم ریز
سرمستِ مئے لذتِ دردم بخرام آر   ویں شیشۂ دل بشکن و در رہگذرم ریز
ہر خوں کہ عبث گرم شود در دلم افگن   ہر برق کہ بے صرفہ جہد بر اثرم ریز
ہر جا نمِ آبیست بمژگانِ ترم بخش   از قلزم و جیحوں کفِ خاکے بسرم ریز
از شیشہ گر آئیں نتواں بست تبسم را   بارے گلِ پیمانہ بجیبِ سحرم ریز
بگریم کہ بہ افشاندنِ الماس نیرزم   مشتے نمکِ سُودہ بزخمِ جگرم ریز
ایں سوزِ طبیعی نگدازد نفسم را   صد شعلہ بیفشارد بہ مغزِ شررم ریز
مسکیں خبر از لذتِ آزار ندارد   خارم کن و در رہ گذرِ چارہ گرم ریز
وجہے کہ بہ پا مزدِ تواں داد ندارم   آبم کن و اندر قدمِ نامہ برم ریز

دارم سرِ ہم طرحیٔ غالبؔ چہ جنون ست
یارب ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ   تُرا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ

خوش ست کوثر و پاکست بادہ کہ درو ست   ازاں رحیقِ مقدس دریں خمار چہ حظ
چمن پُر از گل و نسرین و دلربائے نے   بدشتِ فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ حظ
در آنچہ من نتوانم ز احتیاط چہ سود   بدانچہ دوست نخواہد ز اختیار چہ حظ
چنیں کہ نخلِ بلند ست و سنگ ناپیدا   ز میوہ تا نفتد خود ز شاخسار چہ حظ
نہ ہر کہ خونی و رہزن بپایۂ منصور ست   بدیں حضیضِ طبیعی ز اوجِ دار چہ حظ
بہ بندِ زحمتِ فرزند و زن چہ می کُشتیم   ازیں نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ
بعرضِ غصہ نظیری وکیل غالبؔ بس!
اگر تو نشنوی، از نالہ ہائے زار چہ حظ

بحر اگر موج زنست از خس و خاشاک چہ باک   با تو ز اندیشہ چہ اندیشہ و از باک چہ باک
وحشتے نیست اگر خانہ چراغے دارد   با دل از تیرگئ زاویۂ خاک چہ باک
با رضائے تو ز ناسازئ ایام چہ بیم   با وفائے تو ز بے مہرئ افلاک چہ باک
کلکِ ما تا بہ کفِ ماست ز دشمن چہ ہراس   چوں فریدوں علم آراست ز ضحاک چہ باک
طبعم از دخلِ خساں باز نہ استد ز سخن
شعلہ را غالبؔ از آویزشِ خاشاک چہ باک

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم   در بزمِ رنگ و بُو نمطے دیگر افگنم
در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست   ناہید را بزمزمہ از منظر افگنم
معشوقہ را ز نالہ بد انساں کنم حزیں   کز لاغری ز ساعدِ او زیور افگنم

ہنگامہ را ز جیبِ جنوں بر جگر زنم اندیشہ را ہیولائے فسوں در سر افگنم
نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم ابرم کہ ہم بروئے زمیں گوہر افگنم
با غازیاں ز شرحِ غمِ کارزارِ نفس شمشیر را برعشہ ز تن جوہر افگنم
با دیریاں ز شکوۂ بیدادِ اہلِ دیں مہرے ز خویشتن بدلِ کافر افگنم
ضعفم بہ کعبہ مرتبۂ قربِ خاص داد سجادہ گستری تو و من بستر افگنم
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
راہے ز کنجِ دیر بہ مینو کشودہ ام از خم کشم پیالہ و در کوثر افگنم
منصورِ فرقۂ علی اللہیاں منم آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم
ارزندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست خود را بخاکِ رہ گزرِ حیدر افگنم

غالبؔ بہ طرحِ منقبتِ عاشقانۂ
رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم
بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے برہگزر پاشیم مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مُطرِب و ساقی از انجمن رانیم   بکار و بار زنے کارواں بگردانیم
گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم   گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم
نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم   بشوخیٔ کہ رُخِ اختراں بگردانیم
ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم   بلائے گرمیٔ روز از جہاں بگردانیم
بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم   ز نیمہ رہ رمہ را با شباں بگردانیم
بجنگ باج ستانانِ شاخساری را   تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بہ صُلح بال فشانانِ صبحگاہی را   ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو، ز ما عجب نبود   گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

تازہ بوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شُدن   ایں مَے از قحطِ خریداری کہن خواہد شُدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بُودہ است   شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شُدن
حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت   دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شُدن
شاد باش اے دل دریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست   شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شُدن
ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید   ہم بساطِ بزمِ مستی پُرشکن خواہد شُدن
از تب و تابِ فنا یکبارہ چوں مشتے سپند   ہر یکے گرمِ وداعِ خویشتن خواہد شُدن
حسن را از جلوۂ نازش نفس خواہد گداخت   نغمہ را از پردۂ سازش کفن خواہد شُدن

دہر بے پروا عیارِ شیوہ ہا خواہد گرفت
داوری خوں در نہادِ ما و من خواہد شدن
پردہ ہا از روئے کارِ ہمہ گر خواہد فتاد
خلوتِ گبر و مسلماں انجمن خواہد شدن
گردِ پندارِ وجود از رہگذر خواہد نشست
بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن
در تہِ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانہ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

حق کہ تعقّتِ جمعیت فلانی بشنو
بشنو، گر تو خداوندِ جہانی بشنو
"لن ترانی" بجوابِ "ارنی" چند و چرا؟
من نہ اینم کہ شناس، تو نہ آنی بشنو
سمعے خود خوان و بخلوت گہِ خاصم جادہ
آنچہ دانی، بہ شمار، آنچہ ندانی بشنو
پردۂ چند بہ آہنگِ نکیسا بسرائے
غزلے چند بہ ہنجارِ فغانی بشنو
لختے آئینہ برابر نہ و صورت بنگر
پارۂ گوش بہ من دار و معانی بشنو
ہر چہ سنجم بتو ز اندیشۂ پیری بپذیر
ہر چہ گویم بتو از عیشِ جوانی بشنو
داستانِ من و بیداری شبہائے فراق
تا نہ خسپی و بپایم ننشانی بشنو
چارہ جو نیستم و نیز فضولی نہ کنم
من و اندوہ تو چند انکہ توانی بشنو
زینکہ دیدی بہ تجسّم طلبِ رحم خطاست
سخنے چند ز غمہائے نہانی بشنو
نامہ در نیمۂ رہ بود کہ غالبؔ جاں داد
ورق از ہم بدر و ایں مژدہ زبانی بشنو

دولت بہ غلط نبود، از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد۔ ناچار مسلماں شو
از ہرزہ رواں گشتن، قلزم نتواں گشتن
جوئے بخیاباں رو۔ سیلی بہ بیاباں شو

ہم خانہ بساماں بہ، ہم جلوہ فراواں بہ   در کعبہ اقامت کن، در بتکدہ مہماں شو
آوازۂ معنی را بر سازِ دبستاں زن   ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو
گر چرخِ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ   ور گوئے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو
آوردہ غمِ عشقم در بندگی ایزد   اے داغ بدل در رو وز جبہہ نمایاں شو
سرمایہ کرامت کن۔ وانگاہ بتجارت بر   بر خرمنِ ما برقے بر مزرعہ باراں شو

جاں داد بغم غالبؔ، خوشنودیِ روحش را
در بزمِ عزا مے کش در نوحہ غزلخواں شو

گستاخ گشتہ ایم، غرورِ جمال کو   پیچیدہ ایم سر ز وفا گوشمال کو
تا کے فریبِ حلم؟ خدارا، خدا نۂ   آں خوئے خشمگین و ادائے ملال کو
برگشتہ ام ز مہر و نمی گیریم بہ قہر   دارم دو صد جواب ولے یک سوال کو
یا می گسست صحبت و یا می فزود ربط   لیکن مرا ملال و ترا انفعال کو
خواہی کہ برفروزی و سوزی درنگ چیست   خواہم کہ تیز سوئے تو بینم مجال کو
گر گفتہ ایم کشتن و بستن بما مخند   مارا اقتدار کے بسزا در خیال کو
داغم ز رشکِ شوکتِ صنعاں ولے چہ سود   آں دستگاہِ طاعتِ ہفتاد سال کو
من بوسہ جو و تو بہ سخن داریم نگاہ   لب تشنہ با گہر چہ شکیبد زلال کو
در بادۂ طہور غمِ محتسب کجا   در عیشِ خلد لذتِ بیمِ زوال کو
غالبؔ بشعر کم ز ظہوریؔ نیم ولے   عادل شہِ سخن رسِ دریا نوال کو

دارم دلے ز غصہ گرانبار بودہ　　بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودہ
دل آں بلا کزو نفسے برقِ خرمنے　　بخت آنچناں کنود اثرِ مرگ دُودہ
از بہرِ خویش ننگم و دارم ز بخت چشم　　خود را در آب و آئینہ رُخ نانمودہ
گمنام و زہد کیشم و خواہم بمن رسد　　در رخت خوابِ شاہ بمستی غنودہ
خواہم ز خواب بر رُخِ لیلے کشائمش　　چشمے نگہ بپردۂ محمل نسودہ
خواہم شود بہ شکوہ و بیچارہ رامِ من　　در گونہ گوں ادا بزبانہا ستودہ
با دین و دانشے چو منے تا چہا کنند　　سجادہ و عمامہ ز صنعاں ربودہ
با دوستاں مباحثہ دارم ز سادگی　　در بابِ آشنائی نا آزمودہ
خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند　　جز روزۂ درست بصہبا کشودہ

در بزمِ غالب آو بشعر و سخن گرائے
خواہی کہ بشنوی سخنِ ناشنودہ

بدل ز عربدہ جائے کہ داشتی داری　　شمارِ عہد و وفائے کہ داشتی داری
تو کے ز جور پشیماں شدی چہ میگوئی!　　دروغِ راست نمائے کہ داشتی داری
بسینہ جوشِ دل و در دل چو جاں خمیدی باز　　نگاہِ مہر فزائے کہ داشتی داری
عتاب و مہرِ تو از ہم شناختن نتواں　　خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
خرابِ بادۂ دوشینہ سرت گردم　　ادائے لغزشِ پائے کہ داشتی داری
بہ کردگار نگر دیدی و ہماں بفسوس　　حدیثِ روزِ جزائے کہ داشتی داری

کرشمہ بار نہالے کہ بودۂ ہستی بسر ز فتنہ ہوائے کہ داشتی داری
جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب
تُرا چہ باک خُدائے کہ داشتی داری

دیدہ ور آنکہ تا نہدٗ دِل بشُمارِ دلبری
در دِلِ سنگ بنگردٗ رقصِ بُتانِ آذری
اے تو کہ ہیچ ذرہ را جُز برہِ تو رُوئے نیست
در طلبت تواں گرفتٗ بادیہ را برہبری
ہر کہ دلست در برش، داغِ تو رویدش ز دِل
تا چہ بدیگرے دہدٗ باز بُری بداوری
رشکِ ملک چہ و چرا، چُوں بتو رہ نمی بُرد
بیہدہ در ہوائے تو، می پرد از سُبکسری
حیف کہ من بخوں تپم، وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری
کوثر اگر بمن رسدٗ خاک خورم ز بے نمی
طوبےٰ اگر ز من شودٗ ہیمہ کشم ز بے بری
بینیم از گداز دلٗ در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

ترانۂ شوق

زمن گرت نہ بود باورِ انتظار بیا   بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمیشود خرسند   بمرگِ من! کہ بسامانِ روزگار بیا
بہانہ جُواست در الزامِ مدعیٔ شوقت   یکے بر غمِ دلِ نا اُمیدوار بیا
ہلاکِ شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را   عناں گُسستہ تر از بادِ نوبہار بیا
زما گسستی و با دیگراں گرو بستی   بیا کہ عہدِ وفا نیست اُستوار بیا
وداع و وصل جُداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
تو طفلِ سادہ دل و ہمنشیں بدآموزست   جنازہ گر نہ تواں دید بر مزار بیا
فریب خوردۂ نازم چہا نمے خواہم   یکے بہ پُرسشِ جانِ اُمیدوار بیا
ز خوئے تُست نہادِ شکیب نازک تر   بیا کہ دست و دلم میرود ز کار بیا
رواجِ صومعہ ہستیست زینہار مرو   متاعِ میکدہ مستیست ہوشیار بیا

حصارِ عافیتے گر ہوس کنی غالب
چُو ما بہ حلقۂ رندانِ خاکسار بیا

واسوخت

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے   گُل دیدمے و رُوئے تُرا یاد کردمے
رفت آنکہ گر براہِ تو جاں دادمے ز ذوق   از موجِ گرد دراہ نفس ایجاد کردمے
رفت آنکہ گر نسبت نہ بہ نفریں نواختے   رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے
رفت آنکہ قیس را بسترگی ستودمے   در چابکی ستائشِ فرہاد کردمے
رفت آنکہ جانبِ رُخ و قدت گرفتمے   در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے
رفت آنکہ در ادائے سپاسِ پیامِ تو   ہر گونہ مُرغِ صد قفس آزاد کردمے
اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم   رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے
بندم منہ زُطرہ کہ تابم نماندہ است   رفت آنکہ خویش را بلا شاد کردمے
آخر بداد گاہِ دگر او فتاد کار   رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کردمے

غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزمِ خلخ و نوشاد کردمے

گُربۂ غالب

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے　　کز بالِ پریزاد بود موجِ رمِ او
سرمستِ ادا چوں بزمیں باز خرامد　　از خاک دمد غنچہ زنقشِ قدمِ او
چُوں صُورتِ آئینہ از افراطِ لطافت　　آید بنظر بچۂ او از شکمِ او
ہر شبپرِ ثریالے کہ ببینی بہ نیستاں　　دارد سرِ دریوزۂ غرشِ زدمِ او
گر جانورے مُردہ بہ بیند سرِ راہے　　از پاکیٔ طینت نخورد غیرِ غمِ او
ہر بچّہ کہ گنجشک بوے باز سپارد　　در پرورشِ او نخورد جُز قسمِ او
آرے بود از غیرتِ اندازِ خرامش　　بر کبک و تذروست اگر خود ستمِ او
رخشندہ ادیمِ تنش از لطفِ زبانش　　گوئی بہ اثر تابِ سہیل ست نمِ او
جوشِ گل و بالیدگیٔ موجۂ رنگست　　دُم لابہ کناں آمدنِ دمبدمِ او
در عربدہ چوں بند زدم باز کشائی　　لرزہ شکنِ طرّۂ خوباں زخمِ او

تا چہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر
باد اکفِ دستِ من و پشت و شکمِ او!

* * *

قطعہ

چُوں مرا نیست دستگاہِ ستیز   چُوں مرا نیست رسم و راہِ مصاف
مے کشائم لبے بہایا ہائے   مے کشم خنجرِ زباں ز غلاف
لیک در ہجو بایدم امساک   در شکایت نشایدم اسراف
بندہ را بُودہ است از سرکار   دست مزدِ مشقتِ اسلاف
زرِ سالانہ برائے دوام   وجہِ شائستہ بقدرِ کفاف
ملزمم کردہ اند ہاں بدروغ   حقِ من خوردہ اند ہیں بگزاف

آہ از اقربائے بے آزرم
داد از حاکمانِ نااِنصاف

قطعۂ ہجویہ

ایا بے ہُنر دُشمنِ دیوسار   چہ نازی بہنگامۂ زور و زر
ز ما باش فارغ کہ ما فارغیم   نداریم پروائے ایں شور و شر

ترا شیوہ دزدی و ما بینوا
تو بدرُد بدگو و ما کور و کر

نوائے سروش

غالب افسرده دل و جاں بیا
بے سر و پا در صفِ رنداں بیا
بیخبراں را خبرے باز ده
زاں مئے دیرین قدرے باز ده
آں اثرِ پرده سازت چه شد؟
زمزمهٔ خارا گدازت چه شد؟
آں نفسِ ناله کمندت کجاست؟
واں نگهِ جلوه پسندت کجاست؟
در ہوسِ جاه فرو رفتهٔ
حیف که در چاه فرو رفتهٔ
راه غلط کرده بافسونِ دیو
می سپری مرحلهٔ رنگ و ریو
بنده زر بودن از اہرمنیست
مردِ خدا ایں چه خدا دشمنیست
آه ز دنیا طلبیہائے تو
ویں همه ابرام و تقاضائے تو
گر مئے خونت که ازیں بیش بود
صرف بر انداختنِ خویش بود
آتشِ ہنگامه بجاں داشتی
داغِ مغاں شیوهٔ بتاں داشتی
آں همه دیوانگی و جاہلی
ویں همه ناکامی و بے حاصلی
آں همه بیراہه رویہائے تو
ویں همه بیصرفه دویہائے تو
آں ز جنوں برق بخرمن زدن
ویں بخمِ دامِ ہوس تن زدن
نیمهٔ شب از عمرِ تو در خواب رفت
نیمه به پیمودنِ مہتاب رفت

ہیں کہ دریں کارگہِ پیچ پیچ   حاصلِ سعیِ تو ہیچ است، ہیچ
اے ہمہ تن وسوسہ سود تو کو؟   دہر سراب است وجودِ تو کو؟
خلق کہ از وہم نمودیش ہست   وہم تو دانست کہ بودیش ہست
پیرویِ وہم مکن زینہار   سر ز گریبانِ حقیقت برآر
خیز و چو منصور نوائے بزن   ہستیِ خود را سرِ پائے بزن
ساقیِ ہمت کہ صلائے دہد   بادہ ز خمخانۂ لا می دہد
ہمت اگر بال کشائی کُند   صعوہ تواند کہ ہمائی کُند
نیرِ توفیق اگر بر دہد   لالہ عجب نیست کز اخگر دہد
ہمتِ ما نیز شہودِ حق است   ہر چہ بسنجیم وجودِ حق است
ہمتِ ما غیرتِ حق است و بس   کثرتِ ما وحدتِ حق است و بس

از اثرِ سطوتِ حق در کلام
حرف ز لب میرمدم والسلام

زندگی

تو نالی از خلۂ خار و ننگری کہ سپہر   سرِ حسینؓ علیؓ بر سناں بگرداند
بر و بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا   چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند   کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

جواہراتِ پریشاں

بپایانِ محبت یاد مے آرم زمانے را   کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را
ندارم تابِ ضبطِ راز و می ترسم ز رسوائی   مگر جویم ز بہرِ ہمزبانی بے زبانے را

* * *

عُمرے بپیری گشت و ہماں بر سرِ جور است   گویند بتاں را کہ وفا نیست چرا نیست
جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل   تعمیر باندازۂ ویرانۂ ما نیست

* * *

انتظارِ جلوۂ ساقی کباب مے کند   مے بساغر آبِ حیواں و بمینا آتشست
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلا   قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتشست

* * *

ناچار با تغافلِ صیاد ساختیم   پنداشتیم کہ حلقۂ دام آشیانہ ایست
پابستۂ نوردِ خیالی چو وارسی   ہر عالمے ز عالمِ دیگر فسانہ ایست
غالب دگر ز منشاء آوارگی مپرس   گفتیم کہ جبہہ را ہوسِ آستانہ ایست

* * *

امشب آتشیں روئے گرم زند خوانیہاست   کز لبش نوا ہر دم در شرر فشانیہاست
کشتۂ دلِ خویشیم کز ستمگراں یکسر   دیدہ دلفریبیہا گفتہ مہربانیہاست

بیخود بزیرِ سایۂ طوبےٰ غنودہ اند   شبگیرِ رہروانِ تمنّا بلند نیست

ہم وعدہ و ہم منع ز بخشش چہ حجابست   جاں نیست مگر نتواں داد شرابست
در مژدہ ز جوئے عسل و کاخ زمرّد   چیزے کہ بدلبستگی ارزد مئے نابست
از جلوہ بہنگامہ شکیبا نتواں شد   لب تشنۂ دیدار ترا خلد سرابست

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یکدگر اند
روزِ روشن بوداعِ شبِ تار آمد و رفت

اخترے خوشتر ازینم بجہاں میبایست   خردِ پیر مرا بختِ جواں میبایست
بزمینے کہ بہ آہنگِ غزل بنشینیم   خاک گلبوئے و ہوا مشک فشاں میبایست
بر نتابم بسبو بادہ ز دور آوردن   خانۂ من بسرِ کوئے مغاں میبایست
یا تمنائے من از خلدِ بریں نگذشتے   یا خود امید گہے درخورِ آں میبایست

گُل فراواں بُود و مے پُر زور و دشمن بر بساط   خُود بخُود پیمانہ میگیرد دید گر دیدن نداشت
گرمنافی وصل ناخوش در موافق ہجرِ تلخ   دیدہ را غم کرد روے دوستاں دیدن نداشت
بُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت   ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

منت از دل نمیتواں برداشت   شکر ایزد کہ نالہ بے اثر است
قفس و دام را گناہے نیست   ریختن در نہادِ بال و پر است
ریزد آں برگ و ایں گُل افشاند   ہم خزاں ہم بہار در گزر است

از یک سبو است بادہ و قسمت جُدا جُدا است   جمشید جام بُرد و قلندر کدو گرفت
رضواں چو شہد و شیر بہ غالبؔ حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

دریں روش بہ چہ اُمید دل تواں بستن   میانۂ من و او شوق حائل اُفتاد است

در پردہ رُسوائی منصور نوائیست   رازت نشنودیم ازیں خلوتیاں ہیچ

بمن گرائے و وفا جو کہ سادہ برہمنم   بسنگ ہر کہ دہد دل بغمزۂ چُوں ندہد

خون ہزار سادہ بگردن گرفتہ اند   آنانکہ گفتہ اند نکویاں نکو کنند
لب تشنہ جوئے آب شمارد سراب را   می زیبد از بہستیٔ اشیا غلو کنند

پیداست بے نیازیٔ عشق از فنائے ما   گر زورقے شکست ز دریا چہ میرود
با ما کہ محو لذت بیداد گشتہ ایم   دیگر سخن ز مہر و مدارا چہ میرود
ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم   غالبؔ دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند   کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروئے تو بود

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد   زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد
بوصل لطف باندازۂ تحمل کن   کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

تمکین برہمن دلم از کفر بگرداند   بتخانہ بتے خانہ بر انداز ندارد

گر رفتہ ام ز کوئے تو آساں نرفتہ ام   ایں قصہ از زبان عزیزاں شنیدہ باد
ذوقیست ہمدمی بفغاں بگزرم ز رشک   خار رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ باد

بغرضِ شہرتِ خویش احتیاجِ ما دارد   چو شعلۂ کہ نیاز او فتد بخار و خسش
زیاس گشتہ سگِ نفس در تلاش دلیر   مگر ز رشتۂ طولِ امل کنم مرسش
مرا بہ غیر زیک جنس در شمار آورد   فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش
خوشم کہ دستِ خود آشنا بہ بوریا باشد   کہ در گماں نسگالم اُمیدگاہ کسش

بہ خلد از سردیِ ہنگامہ خواہم   بر افروزم بگردِ کوثر آتش
خنک شوخیکہ در دوزخ بغلطد   مے آتش، شیشہ آتش، ساغر آتش
دلے دارم کہ در ہنگامۂ شوق   سرشتش دوزخ است و گوہر آتش
بسانِ موج میبالم بہ طوفاں   برنگِ شعلہ مے رقصم در آتش

در سلوک از ہر چہ پیش آید گزشتن داشتم   کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش
بر اُمیدِ شیوۂ صبر آزمائے زیستم   تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش

فرسودہ رسمہائے عزیزاں فرو گذار   در شورِ نوحہ خواں و بہ بزمِ عزا برقص

تکیہ بر عہدِ زبانِ تو غلط بُود غلط   کایں خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود غلط
غنچہ را نیک نظر کردم ادائے دارد   دیں کہ ماند بدہانِ تو غلط بود غلط
ایں مسلّم کہ لبِ ہیچ مگوئے داری   خاطرِ ہیچمدانِ تو غلط بود غلط

رنگ و بُو بود ترا برگ و نوا بُود مرا
رنگ و بُو گشت کہن برگ و نوا گشت تلف
گیرم امروز دہی کامِ دل آں حُسن کجا
اجرِ ناکامیٔ سی سالۂ ما گشت تلف
کاش پاۓ فلک از سیر بماندے غالبؔ
روزگارے کہ تلف گشت چرا گشت تلف

از عشق و حسنِ ما و تو باہمدگر در گفتگو
خسرو و مجنوں یک طرف شیریں و لیلیٰ یکطرف

در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ اُمید نیست
فرہنگنامہ ہاۓ تمنا نوشتہ ایم

میر بامِ بوسہ و عرضِ ندامت میکنم
اختراعے چند در آدابِ صحبت مے کنم
سنگ و خشت از مسجدِ ویرانہ می آرم بشہر
خانہ در کوئے ترسایاں عمارت مے کنم
کردہ ام ایمانِ خود را دستمزدِ خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت مے کنم

حسرتِ روۓ ترا حور تلافی نکند
از تو آخر بچہ اُمید شکیبا باشم

سر از حجابِ تعین اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش میتواں کردن

مائیم و ذوقِ سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ
در عشق نیست کفر ز ایماں شناختن

رُباعیات

کشتی از موج سوئے ساحل برود   رہرو از جادہ تا بمنزلِ برود
خود شکوہ دلیلِ رفعِ آزار بس است   آید بزباں ہر آنچہ از دل برود

* * *

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش   آنروز کہ وقتِ باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم   با حسرتِ عیشہائے ناکردۂ خویش

* * *

گر دیدن زاہداں بجنّت گستاخ   ویں دست درازی بہ ثمرِ شاخ بہ شاخ
چُوں نیک نظر کنی بہ روئے تشبیہ   مانند بہ بہائم و علف زارِ فراخ

بادۂ شیراز

غزلیات

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را رشک نگزارد کہ گویم نام را
آں مے‌ام باید کہ چوں ریزم بجام زورِ مے در گردش آرد جام را
بے گناہم پیرِ دیر از من مرنج من بمستی بستہ ام احرام را
از دلِ تست آنچہ بر من میرود مے شناسم سختیٔ ایام را
تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود خوش بود گر دانہ نبود دام را
ما کجا او کو چہ سودا در سرست ذرہ ہائے آفتاب آشام را

دل ستاں در خشم و غالب بوسہ جو
شوق نشناسد ہمے ہنگام را

بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفتست بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست
بدیں نیاز کہ باتست ناز میرسدم گدا بسایۂ دیوارِ پادشا خفتست
بہ صبحِ حشر چنیں خستہ رو سیہ خیزد کہ در شکایتِ درد و غمِ دوا خفتست

خروشِ حلقہ رِندان ز نازنین پسرے است   کہ سر بزانوئے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگہِ خلق   عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست
دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد   کہ دُزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
درازیٔ شب و بیداریٔ من اینہمہ نیست   زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست
ببیں ز دور و مجو قربِ شہ۔ کہ منظر را   دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست
براہ خفتنِ من ہر کہ بنگرد داند   کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفتست
دگر ز ایمنیٔ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ؟   مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

بخواب چوں خودم آسودہ دل مداں غالبؔ
کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است نا خفتست

بمرگِ من! کہ پس از من زمرگِ من یاد آر   بکوئے خویشتن آں نعشِ بے کفن یاد آر
من آں نیم کہ زمرگم جہاں بہم نخورد   فغانِ زاہد و فریادِ برہمن یاد آر
بہ بام و در ز ہجومِ جوان و پیر بکوے   بکوے و برزن انبوہِ مرد و زن یاد آر
بساز نالہ گروہے ز اہلِ دل دریاب   بہ بندِ مرثیہ جمعے ز اہلِ فن یاد آر
بخود شمار وفاہاے من زمردم پُرس   بمن حساب جفاہائے خویشتن یاد آر
چہ دید جانِ من از چشمِ پُرخمار بگو   چہ رفت بر سرم از زلفِ پُرشکن یاد آر
بسنج تا ز تو بر من بداں محل چہ گذشت   نخواندہ آمدنِ من در انجمن یاد آر

ہزار خستہ و رنجور در جہاں داری
یکے ز غالبِ رنجور خستہ تن یاد آر

دیدم آں ہنگامہ بے جا خوفِ محشر داشتم خود ہماں شورست کاندر زیست در سر داشتم
طولِ روزِ حشر و تابِ مہر ذوقے بودہ بس جلوۂ برقے در ابر و دامنِ تر داشتم
تا چہ سنجم دوزخ و کوثر؟ کہ من نیز ایں چنیں آتشے در سینہ و آبے بساغر داشتم
دوش بر من عرض کردند آنچہ در کونین بود زاں ہمہ کالائے زنگار رنگ دل بر داشتم
از خرابی شد فنا حاصل خوشم زیں اتفاق بود مقصودم محیط و سیل رہبر داشتم
کور بودم کز حرم راندند رفتم سوئے دیر از جمالِ بت سخن مے رفت باور داشتم
سوزم از حرمانِ مے با آنکہ آنم در سبوست تا چہ می کردم اگر بختِ سکندر داشتم

ہیچ مے دانی کہ غالب چوں بسر بردم بدہر
منکہ طبعِ بلبل و شغلِ سمندر داشتم

شاہا بہ بزمِ جشن چو شاہاں شراب خواہ زر بے حساب بخش و قدح بے حساب خواہ
بزمت بہشت و بادہ حلالست در بہشت گر باز پرس رود دہد از من جواب خواہ
تو پادشاہِ عہدی و بختِ تو نوجواں بر خور ز عمر و باجِ نشاط از شباب خواہ
در روزہائے فرخ و شبہائے دلفروز صہبا بروزِ ابر و شبِ ماہتاب خواہ
گل بوے و شعر گو و گہر پاش و شاد باش مستی ز بانگِ بربط و چنگ و رباب خواہ
خونِ سیاہ نافہ آہو چہ بو دہد از حلقہائے زلفِ بتاں مشکِ ناب خواہ

خواہش ازیں گروہِ پری چہرہ ننگ نیست   از چشم غمزہ وز شکنِ طرہ تاب خواہ
از رازہا حکایتِ ذوقِ نگاہ گوئے   از کارہا کشائشِ بندِ نقاب خواہ
ہر چند خواستن نہ سزاوارِ شانِ تست   قوت نطالع و نظر از آفتاب خواہ
در برگ و ساز گوئے نشاط از بہار بر   در بذل وجود جیبِ خویش از سحاب خواہ
از شمعِ طور خلوتِ خود را بساط ساز   از ماہِ نو جبینتِ خود را رکاب خواہ

غالب قصیدہ را بشمارِ غزل در آر
ورزش بریں غزل رقمِ انتخاب خواہ

نغمۂ توحید

اے ز وہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ   گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پُر وانگہے   پردہ رسمِ پرستش در میاں انداختہ
نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ   شور در عالم ز حسنِ بے نشاں انداختہ
چرخ را در قالبِ ابداع دوّار ریختہ   خاک را بر نطعِ پیدائی ستاں انداختہ
عاشقاں را موقفِ دار و رسن وا داشتہ   غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ
غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد   بہرِ آسانی اساسِ آسماں انداختہ
گل چو ماند دیر گردد پر دلش بازار سرد   بہرِ تجدیدِ طرب طرحِ خزاں انداختہ

آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ   شعلہ در جانِ مرغِ صبح خواں انداختہ
جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد   کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ
جز بدیں الماس نتواں ایں چنیں دُر دانہ سفت   رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ
تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود   دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ
تا علاجِ خستگی آسائش دیگر دہد   خارہا در رہ گزارِ میہماں انداختہ
مے سرایم نغمۂ توحید و شورِ ایں نوا
چوں نیم سوراخہا در استخواں انداختہ   ق سنہ ۱۸۴۱ء

ترکیب بند

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام   شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام
اینت خلوتخانۂ روحانیاں کانجا ز دور   زہرہ را اندر ردائے نورِ عریاں دیدہ ام
ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش   تو لطفے را در دو عشرت گہ دو مہماں دیدہ ام
ہر گز اے ناداں بہ رسوائی ز بندی دل کہ من   ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزاں دیدہ ام
رفتہ ام زاں پس بسیرِ باغ و مرغاں را بباغ   سر بہ سمِ خواب زیرِ بال پنہاں دیدہ ام
کلکِ صبح نکہتِ گل دم ز گردش نازدہ   نامۂ فیضِ سحر بنوشتہ عنواں دیدہ ام
شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ   طرۂ سنبل بہ بالیں بر پریشاں دیدہ ام

باد سرمستانه مے جنبید و شبنم مے چکید　　غنچه را در رختِ خواب آلوده دامان دیده ام
بر صبحِ اوّل گو بروے کس نیاورد از حیا　　صبحِ ثانی را بریں هنگامه خندان دیده ام

محرمِ رازِ نهان روزگارم کرده اند
تا بجرم گوش ننهد خلق خوارم کرده اند

روشناسِ چرخ در جمعِ اسیرانش منم　　نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم
ثابت و سیارِ گردوں را رصد بستم بعلم　　رشتهٔ تسبیحِ گوهرهائے غلطانش منم
نے ز دانش کامیاب و نے بسختی تنگدل　　شرمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم
در لئیمی شهرهٔ دهر از تهیدستیت چرخ　　رفته مسکیں را ز یاد و گنجِ پنهانش منم
تیر نازد گر به ادریسی بخاک اندازمش　　زهره نازد گر به بلقیسی سلیمانش منم
کعبه با من از مروت عذر خواهِ پائے ریش　　ور ز ادب شرمندهٔ خارِ مغیلانش منم
در غریبی خویش را از غصه در دل میخلم　　خورده ام از شستِ غم تیرے که پیکانش منم
نوش چوں راهِ لبم گیرد ادا فهمش نیم　　نیش چوں مغزِ دلم کاود زباندانش منم
مانده ام تنها بکنج از دورباشِ پاسِ وضع　　خانهٔ دارم که پندارند دربانش منم

پایهٔ من جز بچشمِ من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

مرد نه بود کز ستم بر خاطرش بارے رسد　　هم ز خود در رنجم گرم از دشمن آزارے رسد
در رهِ یارم ز رشکِ پائے رہ پیمائے خود　　خوں فتد در دل ز زخمے کز سرِ خارے رسد

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چارسوست
میرود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

راحتِ ما را ز بیرنگی برات آوردہ اند
بت پرستاں را اسلام از نقش و دیوارے رسد

دانش آں باشد کہ چشمِ دل بحق بینا شود
نے گمانِ باطلے کز وہم و پندارے رسد

طورِ نخلِ طور نہ بود گرچہ در خرگاہِ خویش
ہر کس افروزد چراغے چوں شبِ تارے رسد

از دمِ بادِ سحر گاہی دل آساید دلے
جاں فزاتر باشد آں کز یاسمن زارے رسد

خوش بود نہ بوزۂ فیضِ الٰہی از علیؓ
گرچہ از ہر در نصیبِ ہر طلبگارے رسد

کہنہ دانم گر دہندم طیلسانِ مشتری
تازہ گردم از ردائے خواجہ گرمائے رسد

ق
عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم با خدا و با علیؓ دیوانہ ام
۱۸۳۱ء

مکافاتِ عمل

ہست از تمیز گربہ ہما استخواں دہد
آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مردست مرد ہر چہ کند بے خطر کند
رادست راد ہر چہ دہد رائگاں دہد

گلزار را اگر نہ ثمر گل بہم نہد
درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد

گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانہ ضمیر
وانگہ کلیدِ گنج بدستِ زباں دہد

تاروزِ خاک تیرہ نگردد ز رشکِ چرخ
رخشانیٔ ستارہ بریگِ رواں دہد

تا آدمی ملال نگیرد ز یک ہوا   سرما و نوبہار و تموز و خزاں دہد
ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن   تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق   تا آرزوئے کام و مرادِ دہاں دہد
آنرا کہ بخت دسترسِ بذلِ مال نیست   طبعِ سخن رس و خردِ خردہ داں دہد
آنرا کہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست
نعم البدل ز خامۂ پرویں فشاں دہد   ق سنہ ۱۸۴۱ء

نوحہ

وقتست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی   سوزد نفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی
وقتست کہ در سینہ زنی آلِ عبا را   سر نیزہ جنانی شود و رنگ ہوائی
وقتست کہ جبریل ز بے مایگی درد   غم را ز دلِ فاطمہ خواہد بہ گدائی
وقتست کہ آں وگیاں از رہِ تعظیم   ق   بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند   چوں شعلہ دخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ افسردۂ تشویشِ اسیری   دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہِ رہائی
اے چرخ چو آں شد دگر از بہر چہ گردی   اے خاک چو ایں شد دگر آسودہ چرائی
خوں گرد و فرو ریز اگر صاحبِ مہری
برخیز و بخوں غلط گر از اہلِ وفائی

تنہاست حسینؓ ابن علیؓ در صفِ اعدا   اکبرؓ تو کجا رفتی و عباسؓ کجائی
توقیعِ شفاعت کہ پیمبرِ ز خدا داشت   از خونِ حسینؓ ابنِ علیؓ یافت روائی
فریاد ازاں حاملِ منشورِ امامت   فریاد ازاں نسخۂ اسرارِ خدائی
فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی   فریاد ازاں خواری و بے برگ و نوائی
فریاد ز بے چارگیِ خستہ درونی   فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی
غالبؔ جگرے خوں کن و از دیدہ فرو بار
گر روئے شناسِ غمِ شاہِ شہدائی

معذرت

ردیفِ شعر ازاں کردم اختیار گرہ   کہ از منست بر ابروئے شہریار گرہ
گرہ کشائے رموزِ خرد بہادر شاہ   کہ پیشِ ناخنِ تدبیرِ اوست خوار گرہ
ایا شہنشہِ کشور کشائے دشمن بند   ز بندہ در خمِ ابرو روا مدار گرہ
کہ چوں بدیں صفت اندر ضمیرِ من گذری   بہ پیچ و تابِ دلم را دہد فشار گرہ
دلست تنگ ازاں رو مشوشم کہ مباد   شود ز تنگیِ جا در دلم فگار گرہ
بدلکشائیِ گفتارِ من کہ غالبؔ را   مزن بہ رشتۂ امید زینہار گرہ
ازیں گرہ کہ بر ابرو زدی چرا ترسم   کہ در دلت ز صفا نیست پائدار گرہ
نشاطِ سالِ نو و جشنِ ایں ہمایوں سال
بروز ناصیۂ شاہِ نامدار گرہ

خطاب بہ ذوق

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ
"کَے بہ پُر گوئی فلاں در شعر ہمسنگِ من ست؟"
نیست نقصاں یک دو جُزو ست از سوادِ ریختہ
کاں درم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من ست
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من ست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم و آں نُسخہ ارتنگِ من ست
کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلی آئینہ ام ایں جوہر آں زنگِ من ست
ہاں من و یزداں بنائے شکوہ بر مہر و وفاست
تا نہ پنداری بہ پرخاش تو آہنگِ من ست
دوست بُودی شکوہ سر کردم ولے جُرم تو نیست
کاینہمہ بیداد بر من از دلِ تنگِ من ست

بختِ من ناساز و خوئے دوستاں ناساز تر
تا چہ پیش آید کنوں با بختِ خود جنگِ من ست
دشمنی را ہمنفسی شرط است و آں دانی کہ نیست
از تو نبود نغمہ در سازے کہ در چنگِ من ست
در سخن چوں ہم زبان و ہمنوائے من نہ
چوں دلت را پیچ و تاب از رشکِ آہنگِ من ست
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من ست
مے فرستم تا نظرگاہ جہاندار ایں ورق
نامہ بر بادا اگر خود طرزِ رنگِ من ست
دیدہ ور سلطان سراج الدین بہادر شہ کہ او
آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ من ست
جم حشم شاہے کہ در ہنگامۂ عرضِ سپاہ
میتواند گفت دارا را کہ سرہنگِ من ست
انوری و عنصری و خاقانی سلطان منم
پادشا طہمورث و جمشید و ہوشنگِ من ست
شاہ میداند کہ من مداحِ شاہم باک نیست
گر تو اندیشی کہ ایں دستان و نیرنگِ من ست

از ادب دُورم ز خاقاں ورنہ در اظہارِ قرب
خطوہ دگامم تو گوئی میل و فرسنگ من ست
مقطع ایں قطعہ زیں مصرع مصرّع باد و بس
ہر چہ در گفتار فخرِ تُست آں ننگِ منست

ذوق و غالب

دہر گویند ندارد روشِ دانش و داد   ہمہ دارد کہ چو غالب ہمہ دانے دارد
سخن از ہمدمیٔ خامۂ نیسانی ہست   کہ ہر آئینہ چوں من شیر ژیانے دارد
معنی از لفظ مُرادست سخنور نبود   کہ بآہنگ حزیں سازِ بیانے دارد
بسکہ ہر دم رود از زمزمۂ خویش ز خویش   خواجہ داند کہ دلآویز فغانے دارد
مدح کز روئ گزافست شمار و اوصاف   باخود از خوبیٔ گفتار گمانے دارد
روئے خوش باید و تابِ کمر و طرزِ خرام   نبرُد دل ز کف ار مورمیانے دارد
نطق تنہا نبود مشقِ سخن را کافی   سخن این ست کہ ایں تیر کمانے دارد
ہم ازیں جاست کہ دانا دلِ شیراز سرود   بُندہ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد'
دمِ گرمی کہ بمن دادہ بہر کس ندہند   گفتہ باشد سخنے ہر کہ زبانے دارد
خشم را بہ سخن تیز کند تابِ نبیذ   تیغم از گردشِ پیمانہ فسانے دارد

ہمچو شاہدکہ تماشی زند اندر آغوش   خامہ در دست من از ناز فغانے دارد
درد با زمزمۂ مُردہ دلاں بوالعجبیست   مَوجِ عمرُم جُوئے دراں تن کہ روانے دارد

مرثیۂ شاہزادہ

اَے دلِ بچشمِ زخمِ حوادث فگار شو   اَے چشم از تراوشِ دِل اشکبار شو
اَے خوں بدیدہ درد گدازِ جگر فرست   اَے دم بسینہ دُودِ چراغِ مزار شو
اَے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ ساز دہ   اَے سر نہفتہ خاکِ سرِ رہ گذار شو
اَے خاک چرخ گر نتواں زد زجا در آئے   اَے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
اَے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط   اَے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو
اَے ماہتاب رُخے بہ سیلی کبود کن   اَے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو
اَے فتنہ بادِ صُبح وزیدا نیقدر مخسپ   اَے رستخیز وقت رسید آشکار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

بگزر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار   با پادشاہ عہد چہا کرد روزگار
شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را   در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخیکہ بُود موسمِ آتش کہ بر دہد   از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار
مرگ اینچنیں رُخ و تنِ نازک ندیدہ بُود   کاہم اجل بہدیہ روا کرد روزگار

شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار
فرزند بادشہ نشناسد معانقہ آغوشِ گور بہر چہ وا کرد روزگار
اے آنکساں کہ خاکِ دہ شہر مارا توجیہِ آبروئے شما کرد روزگار

ہر چند بے اجل نتواں ہیچگاہ مُرد
آتش بخود زنید کہ فرخندہ شاہ مُرد

اے قوم خویش را بشکیب امتحاں کنید ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید
طفلست شاہزادہ و در رہ خطر بسیست منعش ز عزمِ رہروی آنجہاں کنید
از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید از حیلہ آنچہ رائے شما باشد آں کنید
ہر حرفِ دلنشیں کہ بگوئید ونشود آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید
ور خود ز رفتنش نتوانید باز داشت بخود شوید و جامہ دریدہ فغاں کنید
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید
زنہار پیشِ شاہ مگوئید و بے خبر تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید

اَے اہلِ شہر مدفنِ ایں دُودماں کجاست
خاکم بفرقِ خوابگہِ خسرواں کجاست

اَے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونہ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہُما اے خُفتہ در نشیمنِ عنقا چگونہ
زاں پس کہ با تو آب و ہوائے جہاں نساخت در روضۂ جناں بتماشا چگونہ

باگلرخانِ دہر وفائے نداشتی — باحوریانِ آئینہ سیما چگونہ
ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگوئے کہ تنہا چگونہ
بے مطربِ ندیم و غلامانِ خردسال — بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونہ
بعد از تو شاہ خیلِ ترا برقرار داشت — اینجا عزیز بودۂ آنجا چگونہ

اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
پروانۂ چراغِ مزارِ تو عالمے

قصیدہ

داد گو تا ستم براندازد — طرحِ نُہ چرخِ دیگر اندازد
در رگِ سازِ من نوائے ہست — کہ بمغزِ غولہ اخگر اندازد
زیں نوائے شررفشاں ترسم — کاتش اندر نوا گر اندازد
سرگذشتیست بر زباں کہ زباں — بر من از خویش خنجر اندازد
بامداداں کہ آسماں خواہد — کاہرمن را زپا در اندازد
لمعۂ مہر در رگِ جانش — خلۂ نوکِ نشتر اندازد
تا ز چشتی بہ مبحثِ کشتن — نونِ مصدر ز مصدرے اندازد
زنگباری زنے بماتمِ دیو — از رخِ زشت چادر اندازد
وانگہ از زیرِ گوشۂ چادر — گوہر آمودِ معجر اندازد

گوہر آما پرند در پیچید   از بر دوش گوہر اندازد
کچہ و بارہ گہ فرو فگنند   گاہ خلخال و پرگر اندازد
راہروانِ لوامعِ سحری   ہرچہ خاتوں ز زیور اندازد
برُبائند و ناپدید کنند   خود فلک طرح دیگر اندازد
ناگرفت آں بساط برچیند   ناگزیر آں بنا بر اندازد
چوں عرق کز جبیں چکد در سعی   جبہۂ چرخِ اختر اندازد
ہرکہ بینی ہمی برشتۂ طناب   جامۂ را کہ شد تر، اندازد
رختِ نمناکِ خویشتن گردوں   مے برد تا بہ محور اندازد
تابشِ مہر و جنبشِ ذرات   شور در ہفت کشور اندازد
ہرچہ طفلے کہ ترسد از غوغا   خویشتن را ز منظر اندازد
سایہ را پایۂ نموداری   بادِ پندار در سر اندازد
باد کز بوئے بادہ مست شود   پردہ از روئے گل بر اندازد
ساقئ انجمن نگہ خیز است   بادہ در کاسۂ زر اندازد
مطربِ بزم زخمہ اش تیز است   تاب در زلف مزمر اندازد

کلکِ من ہیں کہ ہر نفس جائے   در رگِ تارِ مسطر اندازد
در سیہ مستی و سر اندازی   ہر کجا ہرچہ درخور اندازد

باسلیماں زند دم از بلقیس   در رہِ مور شکر اندازد
بازُلیخا اگر شود ہمراز   طرح کاخِ مصوّر اندازد
باسمندر اگر بود دمساز   ہمہ آتش بدفتر اندازد
از نوائے کہ در غزل سنجد   حلقہ در گوش رادر اندازد
از طرازے کہ در دُعا بندد   بر ورق مشک اذفر اندازد
آں قدر زی کہ در زمانۂ تو   چرخ را کُہنگی بر اندازد
تا قضا بہرِ آستانۂ تو
طرحِ نُہ چرخِ دیگر اندازد

راز و نیاز

بروزے کہ مردم شوند انجمن   شود تازہ پیوندِ جاں ہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں   بسرمایۂ خویش نازندگاں
گہرہائے شہوار پیش آورند   فروہیدہ کردار پیش آورند
ز نورے کہ ریزند و خرمن کنند   جہاں را بخود چشم روشن کنند
بہنگامہ با ایں جگر گوشگاں   در آیند مشتے جگر توشگاں
ز حسرت بدل بردہ دنداں فرو   ز خجلت سر اندر گریباں فرو
دراں حلقہ من باشم و سینۂ   ز غمہائے ایام گنجینۂ

در آب و در آتش بسر بُردۂ   ز دشوارئے زیستن مُردۂ
بہ بخشائے برناکسی ہائے من   تہیدست و درماندہ ام وائے من
بدوش ترازو منہ بارِ من   نسنجیدہ بگزار کردارِ من
بکردار سنجی میفزائے رنج   گرانبارئے درد عمرم بسنج
اگر دیگراں را بود گفت و کرد   مرا مایۂ عمر رنجست و درد
وگر ہمچنین ست فرجام کار   کہ مے باید از کردہ راندن شمار
مرا نیز یارائے گفتار دہ   چو گویم بداں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزش از من مجو   بود بندۂ خستہ گستاخ گو
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود   چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم اما ز تست   بہ تست ارچہ گفتارم اما ز تست
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم   پرستارِ خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را با ہریمنی   نبردم ز کس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست   بہنگامہ پرواز مورم ازوست
من اندوہگیں و مے اندُہ رُبا   چہ میکردم اے بندہ پرور خدا!
حساب مے و رامش و رنگ و بوئے   ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند   دلِ دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ   بدریوزہ رُخ کردہ باشم سیاہ

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ   نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط   نہ غوغائے رامشگراں در رباط
شبانگہ بہ مے رہنمونم شدے   سحرگہ طلب گارِ خونم شدے
تمنائے معشوقۂ بادہ نوش   تقاضائے بیہودۂ میفروش
چہ گویم چو ہنگامِ گفتن گزشت   ز عمرِ گرانمایہ بر من گزشت
بسا روزگاران بدل دادگی   بسا نو بہاراں بہ بے بادگی
بسا روزِ باران و شبہائے ماہ   کہ بودست بے مے بچشمم سیاہ
اُفقہا پُر از ابرِ بہمن مہی   سفالینہ جامِ من از مے تہی
بہاراں بہ من در غمِ برگ و ساز   درِ خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پُر بو و رنگ   من و حجرہ و دامنے زیرِ سنگ
دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبُود   باندازۂ خواہشِ دل نہ بُود
اگر تافتم رشتۂ گوہر شکست   وگر یافتم بادہ ساغر شکست
سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک   لب از خاکبوسِ بخیلاں چاک چاک
بہ گیتی درم بے نوا داشتی   دلم را اسیرِ ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد   بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل را نجا برانگیزمے   زرش بر گدایاں فرو ریزمے
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم   بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

چوں زاں غمزہ نیشے بدل برخورد   رگِ جاں غم نوکِ نشتر خورد
چُوں آں نامرادی بیاد آیدم
بفردوس ہم دل نیاسایدم

بہشت

صبوحی خورم گر شرابِ طہور   کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور
ہم شب دیہائے مستانہ کو   ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش   چہ گنجائشِ شورشِ نائے و نوش
سیہ مستیٔ ابر و باراں کجا   خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ   غم ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار   چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ اینش کجا   فریبد بسوگند و نیش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گو   دہد کام و نبود دلش کامجو
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو   بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومندِ دلالۂ   نہ دل تشنۂ ماہ پرکالہ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل!

نعت

محمد کز آئینۂ روئے دوست   جزآئینش ندانست واناکہ اوست
زہے روشن آئینۂ ایزدی   کہ در روئے نگنجیدہ زنگِ خودی
زرازِ نہاں پردہ برزدہ   زذاتِ خُدا معجزے سرزدہ
تمنائے دیرینۂ کردگار   بوے ایزد از خویش اُمیدوار
بہر جام ازو تشنۂ جرعہ خواہ   بہر گام ازو معجزے سر براہ
دلِ امید جائے زیاں دیدگاں   نظر قبلہ گاہِ جہاں دیدگاں
برفتار صحرا گلستاں کُنے   بگفتار کافر مُسلماں کُنے
بدنیا ز دیں روشنائی دہے   بہ عقبےٰ ز آتش رہائی دہے
بخوئے خوش اندوہ کاہِ ہمہ   بآمرزش اُمیدگاہِ ہمہ
زبیت بندگی مردم آزاد کُن   جہانے بیک خانہ آباد کُن
زخونیکہ در کربلا شُد سبیل   ادا کرد وامِ زمانِ خلیل

مِعراج

قدم زد براہے کہ رفتن نداشت   نگہبان و ہمراہ و رہزن نداشت
در آنجا کہ از روئے فرسنگ و رائے   بجا باشد از خود نگویند جائے

جهت را دمِ خود نمائی نماند زمان و مکاں را روائی نماند
غبارِ نظر شد ز ره ناپدید سراپائے بینده شد جمله دید
درآورد بے کلفتِ سمت و سوئے بنورِ السموات والارض روئے
تماشا ہلاکِ جمالِ بسیط فروغِ نظر موجۂ زاں محیط
شنیدن شهیدِ کلامِ شگرف منزه ز آمیزشِ صوت و حرف
کلامے به بیرنگئ ذاتِ علم شنیدن بعقل اندر اثباتِ علم
نخستیں ورا ز لا کشود آں رواق ز الّا بعید اندرش پیش طاق
بر الّا رسید و ز لا در گزشت رسیدن ز پیوند جا در گزشت
دراں خلوت آباد راز و نیاز بروئے دوئی بود چوں در فراز
نماند اندر احمد ز میمش اثر که آں حلقۂ بود بیرونِ در
احد جلوه گر با شیونِ صفات نبی محو حق چوں صفات عینِ ذات
دو عالم خروشِ نواہائے راز ولیکن ہماں در خمِ بند ساز
ورق در ورق نکتۂ دلپذیر ولیکن ہماں در خیالِ دبیر
ز گفتن شنیدن جدائی نداشت نمودن ز دیدن جدائی نداشت
چو اندازۂ ہر نمائش گرفت ز وحدت بکثرت گرائش گرفت
بحکمِ تقاضائے حبِ ظهور تنزل در اندیشه آورد زور

احد کسوتِ احمدی یافته
دمِ دولتِ سرمدی یافته

غالب کا اسیریہ

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم   غمِ دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب   خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرواز کنم
در خرابی بہ جہاں میکدہ بنیاد نہم   در اسیری بہ سخن دعویٔ اعجاز کنم
بے مشقت نہ بود قید، بہ شعر آویزم   روزکے چند رسن تابیٔ آواز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم   چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم
تا چہ افسوں بہ خود از ہیبتِ صیاد دمم   تا چہ خوں در جگر از حسرتِ پرواز کنم
یارِ دیرینہ، قدم رنجہ مفرما کاینجا   آں نگنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
ہائے ناسازیٔ طالع کہ بہ من گردد باز   با خرد شکوہ گر از طالعِ ناساز کنم
اہلِ زنداں بسر و چشم خودم جا دادند   تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
جملہ دزدانِ گرفتار، وفا نیست بشہر   خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم
من گرفتارم و ایں دائرہ دوزخ تن تن   در سخن پیرویٔ شیوۂ ایجاز کنم

گرچہ توقیعِ گرفتاریٔ جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوشدلی امیدم نیست

شمع ہر چند بہر زاویہ آساں سوزد   خوشتر آنست کہ بر طاق در ایواں سوزد

عودِ من ہرزہ مسوزید کہ گر سوختنی ست   بجز از بید کہ در مجمرِ سلطاں سوزد
خانہ ام ز آتشِ بیدادِ عدو سوخت دریغ   سوختن داشت ز شمعیکہ شبستاں سوزد
منم آں خستہ کہ گر زخمِ جگر بنمایم   بر من از مہرِ دلِ گبر و مسلماں سوزد
منم آں سوختہ خرمن کہ ز افسانۂ من   نفسِ رہرو و رہزن و دہقاں سوزد
منم آں قیس کہ گر سوئے من آید لیلیٰ   محمل از شعلۂ آوازِ حدی خواں سوزد
تا چسانم گزرد روز بہ شبہا دریاب   از چراغے کہ عسس بر درِ زنداں سوزد
تنم از بند در انبوہِ رقیباں لرزد   دلم از درد بر اندوہِ اسیراں سوزد
از نمِ دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد   از تفِ نالۂ من جوہرِ کیواں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ روشن نشود در شبِ تار   جز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ در وے نتواں یافت ہوا   جز سمومے کہ خس و خارِ بیاباں سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بچراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

پاسباناں ہمہ آئید کہ من مے آیم   درِ زنداں بگشائید کہ من مے آیم
ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے   خیر مقدم بسرائید کہ من مے آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہِ شما مے ترسم   راہم از دور نمائید کہ من مے آیم
رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نہ کند   سخت گیرندہ چرائید کہ من مے آیم
خستہ تن در رہ و تہذیب ضرور ست اینجا   نمک آرید و بسائید کہ من مے آیم

عارضِ خاک بپاشیدن خوں تازہ کنید
رونقِ خانہ فزائید کہ من مے آیم
چوں من آیم بشما شکوہ گردوں نہ رواست
زیں سپس ناز فزائید کہ من مے آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید
بختِ خود را بستائید کہ من مے آیم
تا بدروازۂ زنداں پئے آوردنِ من
قدمے رنجہ نمائید کہ من مے آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است
بہرہ از من بربائید کہ من مے آیم
بخود از شوق ببالید کہ خود باز رہید
بمن از مہر گرائید کہ من مے آیم
بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیِ من
غیر نشگفت ، خورد گر غمِ ناکامیِ من
آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی
آفتاب از جہتِ قبلہ بر آمد گوئی
دل و دستیکہ مرا بود فرو ماند ز کار
شب و روزیکہ مرا بود سر آمد گوئی
سرگزشتم ہمہ رنج و الم آرد گفتی
سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی
بہرۂ اہلِ جہاں چوں ز جہاں درد و غم است
بہرۂ من ز جہاں بیش تر آمد گوئی
خستن و بستنِ من حدِ کس نیست برو
بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی
ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع
خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی
غم دل داشتم اینک غمِ جانم دادند
زخم را زخمِ دگر بر اثر آمد گوئی
چرخ یک مردِ گرانمایہ بزنداں خواہد
یوسف از قیدِ زلیخا بدر آمد گوئی
مژہ امشب ز کجا اینہمہ خوناب آورد
ایں چنیں گرم ز زخمِ جگر آمد گوئی
خود چرا خوں خورم از غم کہ بغمخوارے من
رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی

خواجہ ہست درین شہر کہ از پرسشِ وے　　پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفےٰ خان کہ درین واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

خواجہ دانم کہ بسے روز نمانم در بند　　لیک دانی کہ شب از روز ندانم در بند
نہ پسندم کہ کس آید نتوانم کہ روم　　جانبِ در بہ چہ حسرت نگرانم در بند
خستہ ام خستہ من و دعویٔ تمکیں حاشا　　بند سخت است تپیدن نتوانم در بند
شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم　　از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند
آمہ و خامہ بیارید و سجل بنویسید　　خواب از بخت ہمی وام ستانم در بند
یارب این گوہرِ معنی کہ فشانم ز کجاست　　بند بر دل بود و نیست زبانم در بند
ہر کس از بندِ گراں نالد و ناکس کہ منم　　نالم از خویش کہ بر خویش گرانم در بند
خوئے خوش بہرِ مصیبت زدہ رنجے دگر است　　رنجہ از دیدنِ رنجِ دگرانم در بند
رفتہ در بارۂ من حکم کہ بادو دو دریغ　　شش مہ از عمرِ گرامی گزرانم در بند
اگر این است خود آنست کہ عیدِ اضحیٰ　　گزرد نیز چو عیدِ رمضانم در بند
مدتِ قید اگر در نظرم نیست چرا　　خونِ دل از قترہ بے صرفہ چکانم در بند

نیستم طفل کہ در بندِ رہائی باشم
ہم ز ذوق است کہ در سلسلہ خائی باشم

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود　　چکنم چوں بقضا زہرۂ جنگم نبود

زیں دو رنگ آمدہ صد رنگ خرابی بظہور
گلہ نیست کہ از بخت دو رنگم نہ بود
راز دانا! غمِ رسوائیِ جاوید بلاست
بہرِ آزار غم از قیدِ فرنگم نہ بود
لرزہ از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطر از کامِ نہنگم نہ بود
منم آئینہ و ایں حادثہ زنگ ست ولے
تابِ بدنامیِ آلائشِ زنگم نہ بود
ہمدما دارم اُمیدِ رہائی در بند
دامن از بعدِ رہائی تہِ سنگم نہ بود
جورِ اعداء رود از دل برہائی لیکن
طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نہ بود
بہ شگافِ قلم از سینہ بدل می ریزم
بسکہ گنجائیِ غم در دلِ تنگم نہ بود
حاش للہ کہ دریں سلسلہ باشم خوشنود
چکنم چوں سرِ ایں رشتہ بچنگم نہ بود

بصریرِ قلمِ خویش بود مستیٔ من
اندریں بندِ گراں بین و سبکدستیٔ من

ہمدماں در دلم از دیدہ نہانید ہمہ
غالب غمزدہ را رُوح و روانید ہمہ
للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ
للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ
ہم در آئینِ نظم سحر طرازید ہمہ
ہم در اقلیمِ سخن شاہ نشانید ہمہ
چشمِ بد دور کہ فرخندہ لقائید ہمہ
شاد باشید کہ فرخ گہرانید ہمہ
سُود بینید، وفا دیدہ و نورید ہمہ
زندہ مانید صفا قالب و جانید ہمہ
من بخوں خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ
من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ
درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بود است
من برنجم کہ ہر آئینہ برآنید ہمہ

روزے از مہر نگفتید فلانے چوں است   بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
گر نباشم بجہاں خار و خسے کم گیرید   اینکہ سرو و سمن باغ جہانید ہمہ
چارہ گر نتواں کرد دُعائے کافی ست   دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ
ہفت بند است کہ در بند رقم ساختہ ام   بنویسید و بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نباشم کہ بہر بزم زمن یاد آرید
دارم اُمید کہ در بزمِ سخن یاد آرید

مزارِ آرزوُ

از نکوئی نشاں نمے خواہم   خویش را بدگماں نمے خواہم
زیست بے ذوقِ مرگ خوش نبود   دِل اگر رفت جاں نمے خواہم
باغبانم گرفت و خست و گذاشت   جُز بباغ آشیاں نمے خواہم
کس نمے نالد از فسانۂ من   دردِ دل را بیاں نمے خواہم
ہیچ کس سُودِ من نمے خواہد   ہیچ کس را زیاں نمے خواہم
ہر یکے دشمنیست دوست نما   یاری از اختراں نمے خواہم
آرزوُ عیب نیست خوردہ مگیر   خواہم امّا چُناں نمے خواہم
رنجِ صاحبدلاں روا نہ بُود   سندِ اہلِ زباں نمے خواہم
دوشہا را افگار نہ پسندم   بارہا را گراں نمے خواہم

مور را مار گیر نپذیرم   پشہ را پیلباں نمے خواہم
بہرِ خویش از زمانۂ غدّار   راحتِ جاوداں نمے خواہم
آتش اندر نہادِ من زدہ اند   لالہ و ارغواں نمے خواہم
ہاں دہاں نیستم محال طلب   نوبہار از خزاں نمے خواہم
گہر افشانم و بہا طلبم   سیم و زر رائگاں نمے خواہم
ناں خورش زانگبیں نمے جویم   پیرہن از کتاں نمے خواہم
بالش از مخملم تمنّا نیست   بستر از پرنیاں نمے خواہم
نہ ہما سایہ ام نہ سگ طینت   طعمہ از استخواں نمے خواہم
دل ز معنی لبالب است ولے   خامہ اندر بناں نمے خواہم
نتواں شد طرف بمور و مگس   انگبیں در دکاں نمے خواہم
نتواں کرد با فلک پرخاش   خردِ خردہ داں نمے خواہم
خستۂ چشم زخمِ خویشتنم   ناوکے بر نشاں نمے خواہم
جامہ ز جام و جامے آلودہ است   خواجہ را میہماں نمے خواہم
جا بہ احباب تنگ نتواں کرد   خویش را در جہاں نمے خواہم
خو بہ بیداد کردہ ام غالب   عیدِ نوشیرواں نمے خواہم
با صلیبم فتاد کار بدہر   علمِ کاویاں نمے خواہم
ہاں نگوئی کہ با چنیں خواری   ترکِ ہندوستاں نمے خواہم

ہاں ندانی کہ در نظر گہِ خویش　　زمزم و ناوداں نمے خواہم
ہاں ندانی کہ صدرِ یثرب را　　سجدہ بر آستاں نمے خواہم
خواہشے چند مے کنم لیکن　　کار ہا را رواں نمے خواہم
پائے فرسودہ در رکاب ونیز　　دستِ خود بر عناں نمے خواہم
سخن از عالمِ دگر دارم　　ہمدم و رازداں نمے خواہم
گر بود خود سرودش وحی سرائے　　با خودش ہمزباں نمے خواہم
سینہ صافم قلندرم مستم　　رازِ خود را نہاں نمے خواہم
پایۂ من فرو تر اُفتاد است　　سرِ خود بر سناں نمے خواہم
پایۂ در نظر نماند دگر　　خویشتن را نشاں نمے خواہم
یُوسف از مصر گشتہ خوشدل من　　بہ تلافیِ جناں نمے خواہم
بہ زلیخا شباب بخشیدند　　بختِ خود را جواں نمے خواہم
بر رُخِ حکمتِ موجۂ حق　　غازۂ امتحاں نمے خواہم
عینِ من ہر چہ اقتضا میکرد　　خواستم غیر آں نمے خواہم
چوں حکایت بجائے خویش رسید　　تن زدم داستاں نمے خواہم

ق[1] ۱۸۵۲

---

[1] یہ قصیدہ مطبوعہ دیوان (۱۸۴۵) اور رام پور کے قلمی نسخہ میں نہیں لیکن اس کا ایک شعر مہر نیمروز (۱۸۵۲ء) میں نقل ہوا ہے۔ داخلی شہادت کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ یہ زمانہ قید کی تصنیف ہے۔

قندِ پارسی

ہا پری شیوہ غزالاں زمردم رم شاں   دلِ مردم بخمِ طرّۂ خم در خم شاں
کافرانند جہاں جوئے کہ ہرگز نبود   طرۂ حُور دلآویز تر از پرچم شاں
آشکارا کنش و بدنام و نکونامی جوے   آہ ازیں طائفہ وآنکس کہ بود محرم شاں
رشک بر تشنۂ تنہا روِ وادی دارم   نہ بہ آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں
بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی ہشدار   خستگانند کہ داری و نداری غم شاں
اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم   چہ بما منتِ بسیار نہی از کم شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوتِ شاں مشکفشاں از دم شاں
مومن و نیرِ و صہبائی و علوی وانگاہ   حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدم شاں

سحرِ حلال

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم   کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
زخمہ بر تارم پریشاں میرود   کایں نواہائے پریشاں میزنم
چوں ندیدم کز نوائش خوں چکد   طعنہ بر مرغِ سحر خواں میزنم

خامہ ہمرازِ دمِ گرمِ من است آتش از نَے در نیستاں میزنم
جُوئے شیر از سنگ راندن ابلہی ست بہرِ گوہر تیشہ بر کاں میزنم
دیگراں گر تیشہ بر کاں میزنند من شبیخُوں بر بدخشاں میزنم
گریہ را در دل نشاطے دیگر ست خندہ بر لبہائے خنداں میزنم
باز شوقم در خروش آوردہ است باز ہوئے ہمچو مستاں میزنم
دی بہ یغما دادہ ام رخت و متاع امشب آذر در شبستاں میزنم
در جنوں بیکار نتواں زیستن آتش تیز است و داماں میزنم
خار خارِ چاکِ دیگر داشتم بخیہ بر چاکِ گریباں میزنم
بندِ ہر خواہش ز دل مے بگسلم نقشِ ہر صورت بعنواں میزنم
در رہ از رہزن خطرہا گفتہ اند گام در بیراہہ آساں میزنم
رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند خندہ بر دانا و ناداں میزنم
در خراباتم ندیدستی خراب بادہ پنداری کہ پنہاں میزنم
خوئے آدم دارم آدم زادہ ام آشکارا دم ز عصیاں میزنم
بادہ در ابرِ بہاراں میزدم حالیا در تیرہ باراں میزنم
طعنہ بر دلقِ مے آلودم مزن نیست ساغر مے بہ نیگاں میزنم
غالبم از مے پرستی نگذرم غوطہ در گردابِ طوفاں میزنم
تو درینجا بینی و من خود ہنوز جامِ مے در بزمِ اعیاں میزنم

در ترقی مے نگنجد گفتگو
در تنزّل دم ز عرفاں میزنم
مے ستیزم با قضا از دیر باز
خویش را بر تیغِ عریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر مے کنم
بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم
بر خرامِ زہرہ و رفتارِ تیر
چشمکے دارم کہ پنہاں میزنم
گہ گہے کز پایہ مے آیم فرود
حرف با برجیس و کیواں میزنم
میبُرد از من قضا چنداں کہ من
گوئے گردوں را بہ چوگاں میزنم
آں ہمائے تیز پروازم کہ بال
در ہوائے مصطفےٰ خاں میزنم

حُسنِ تغزّل

دِل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بے داد تواں دید و ستمگر نتواں گفت
در رزم گہش ناچخ و خنجر نتواں بُرد
در بزم گہش بادہ و ساغر نتواں گفت
رخشندگیٔ ساعد و گردن نتواں جُست
زیبندگیٔ یارہ و پہ گر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ تراشد بُت و آزر نتواں گفت
از حوصلہ یاری مطلب صاعقہ تیز است
پروانہ شو اینجا ز سمندر نتواں گفت
ہنگامہ سر آمد، چہ زنی دم ز تظلّم؟
گر خود ستمے رفت، بمحشر نتواں گفت
در گرم روی، سایہ و سرچشمہ نجوئیم
با ما سخن از طوبےٰ و کوثر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بمنبر نتواں گفت

کارے عجب اُفتاد بدیں شیفتہ ما را
مومن نہ بود غالبؔ و کافر نتواں گفت

جُرعات

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را   خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را
چوں فاش شد آخر کہ ہم از خلق گرفتند   بے فائدہ از خلق نہفتند ارم را

گدائے ترک نژادم ز دودۂ سلجوق م فراخ تا نبود خواں نمے خورم ناں را
شود روانیٔ طبعم فزوں ز سختیٔ دہر م بسنگ تیز تواں کرد تیغِ بُراں را

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال م گفتمش کوششِ من در طلبش گفت رواست

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت م کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند
اندر خزانِ خزاں دیدہ نباشم کانہا م ناز بر تازگیٔ برگ و نوا نیز کنند
گفتہ باشی کہ ز ما خواہشِ بیداد خطاست م ایں خطائیست کہ در روزِ جزا نیز کنند!

کسے با من چہ در صورت پرستی حرفِ دیں گوید　　ز آذر گفت دانم کز صورت آفریں گوید
دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم　　کہ با من وسعتِ بتخانہ ہائے ہند و چیں گوید
بخشمم ناسزا میگوید و از لطفِ گفتارش　　گماں دارم کہ حرفِ دلنشینے بعد ازیں گوید
چرا نازند غالب را ازاں در رہروے باید　　کہ رازِ خلوتِ شہ با گدائے رہ نشیں گوید

آتش افروختہ و خلق بہ حیرت نگراں　　رخصتے دہ کہ بہ ہنگامہ ہنر بنمائیم

سرشک افشانیِ چشمِ ترش بیں م شہِ خوباں و گنجِ گوہرش بیں
ادائے دلستانی رفتہ از یاد م ہوائے جانفشانی در سرش بیں
صفائے تن فزوں ترکردہ رسوا م دل از اندیشہ لرزاں در برش بیں
بجا ماندہ عتاب و غمزہ و ناز م متاعِ نارواۓ کشورش بیں
گزشت آں کز غمِ ما بے خبر بود م بخویش از خویش بے پرواترش بیں
برسمِ چارہ جوئی پیشِ غالب م شکایت سنجِ چرخ و اخترش بیں!

نازم آں فتنہ کہ در دشت بغمخواریٔ قیس م لیلیٰ از ناقہ فرود آید و محمل ببرد

ایں گونہ کساں چہ آفرینی م اے خالقِ آسماں و انجم!

رُباعیات

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ   خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبےٰ کہ نشانہا دارد   سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

زانجا کہ دلم بوہم در بند نبود   با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصودِ من از کعبہ و آہنگِ سفر   جز ترکِ دیار و زن و فرزند نبود

در بزمِ نشاط خستگاں را چہ نشاط   از عربدۂ پائے بستگاں را چہ نشاط
گر ابر شرابِ ناب بارد غالبؔ   ما جام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

در عالمِ بے زری کہ تلخست حیات   طاعت نتواں کرد بامیدِ نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ   بودے بوجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

بر قولِ تو اعتماد نتواں کردن   خود را بگزاف شاد نتواں کردن
از کثرتِ وعدہ ہائے پے در پے تو   یک وعدہ درست یاد نتواں کردن

گر در طلبِ دوست بود پائے تو سست   غمگیں مشو
در خود باشی بہ جستجو تو چابک و چست   مغرور مشو
اخلاص بہ نسبت است و نسبت ازلیست   چوں شبنم و مہر
گر جذبہ قوی فتاد و پیوند درست   بیخود می رو

ہر چند تواں بے سر و ساماں بودن   بازیچۂ خوی زشت نتواں بودن
باللہ کہ ز دشنہ بر جگر سخت تر است   ازکردۂ خویشتن پشیماں بودن

اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بسترِ من   ہر خاک کہ باتست ہمہ بر سرِ من
زر بہرِ کساں و بہرِ من دانہ و دام   اے مادرِ دیگراں و مادندرِ من

یارب تو کجائی کہ بہ ما زر نہ دہی   بیدرد خدائی کہ بہ ما زر نہ دہی
نے نے تو نہ غائبی و نے بیرحمی   بے مایہ چہ مائی کہ بہ ما زر نہ دہی

باید کہ جہانے دگر آباد شود   تا کلبۂ ویرانِ من آباد شود
در عالمِ انبساط از من خوشتر   مطرب کہ بہ سوزِ دگراں شاد شود

اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گزشت   در فنِ سخن یگانہ گشتیم و گزشت
مے بود دوائے ما بہ پیری غالبؔ   زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم مباشی کہ فریبند   حق را بسجودے و نبی را بدرودے

گلبنِ ہندی

غزلیاتِ اردو

(سنہ ۱۸۲۷ء سے سنہ ۱۸۳۳ء تک)

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہُوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا مَیں
جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے   طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے   بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں   کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا ق ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
اے سرِ شوریدہ! نازِ عشق و پاسِ آبرو ق یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں   ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا   ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بد مستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ　　جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"　　زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سر نامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ۔ ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا امیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے
رنج رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زار آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی   دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق   تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں   بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا   مَوجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا   کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی ؟

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے   جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر   تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مائگیٔ اشک بجا ہے   جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر   کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ   طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   اِک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک   آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اُسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے

حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اُسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے؟

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے؟
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے؟
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے؟

ق

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

کلکتہ ۱۸۳۰ء

تنہائی کی وادی میں!

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے   کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلکتہ کی یاد

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ ہف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ!
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

غزلیات

(۱۸۳۳ء سے ۱۸۴۷ء تک)

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجُود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں!

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہَل مِن مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں!
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھُری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں"
گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی مَیں
رُوح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہُوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہُوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
مَیں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تمکو وہم نے کس پیچ و تاب میں
مَیں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہُوئی اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہُوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مُدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رُو میں ہے رخشِ عُمر۔ کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہُوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہُود و شاہد و مشہُود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اِک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یُوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہُود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بُوتراب میں

دھوتا ہوں جب مَیں پینے کو اُس سیمتن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں
بھاگے تھے ہم بہت ، سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہُوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں اِس خستہ تن کے پاؤں
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہُوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پاؤں
بیچارہ کتنی دُور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پاؤں
غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟
پیتا ہُوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں
ق ۱۸۶۱

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نو اُمیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
ق ۱۸۶۱
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اُسکو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

مُنہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ مَیں
ق ۱۸۴۱ زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

غزلِ مُشاعرہ

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خُوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق اَے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
رہا بلا میں بھی مَیں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اِک جہاں کے لئے
فلک نہ دُور رکھ اُس سے مجھے کہ مَیں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے اِمتحاں کے لئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خسِ آشیاں کے لئے
گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے
بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسین خان کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملّت و مُلک
بنا ہے چرخِ بریں جسکے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے
ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے ۱۸۴۵

قطعات

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضورِ والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرتِ آدمؑ یہ بیسنی روٹی

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے
[illegible]

متفرقات[1]

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر — مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

---

[1] یہ متفرق اشعار اور رباعیات ۱۸۴۱ء سے پہلے لکھی گئیں۔ اور دیوانِ غالبؔ کے پہلے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہیں۔

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا   سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب ترا احوال سُنا دینگے ہم ان کو   وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب   ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

رُباعیات[1]

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال   ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال   ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم   آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم   ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

---

[1] یہ معلوم نہیں کہ یہ رباعیات اور ردیف واؤ کی غزل کب لکھی گئیں۔ اُن میں یا تو ظفر کے والد اکبر شاہِ ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ یا ظفر کی طرف۔ موخرالذکر صورت میں مرزا بہادر شاہ کی عنایات ۱۸۴۷ء سے پہلے ہی شروع ہو گئی ہوں گی کیونکہ تینوں چیزیں اس سال سے پہلے کی ہیں۔

۹۹

دوشم آہنگ عشا بود کہ آمد در گوش
نالہ از تار ردائے کہ مرا بود بدوش
کاے خس شعلۂ آواز موذن زنہار
از پے گرمیٔ ہنگامہ منہ دل بخروش
تکیہ بر عالم و عابد نتواں کرد کہ ہست
آں یکے بیہدہ گو این دگرے بیہدہ کوش
نیست جز حرف دراں فرقۂ اندر زسرائے
نیست جز رنگ دریں طائفۂ ازرق پوش
جادہ بگزار و پریشاں رو و در رہروی
بفریب می و معشوق مشو رہزن ہوش
بوسہ گر خود بود آساں مبر از شاہدِ مست
بادہ گر خود بود ارزاں مخر از بادہ فروش
حاصل آنست ازیں جملہ نبودن کہ مباش
ما نہ افسانہ سرائیم و تو افسانہ نیوش
منکہ بودی کشم از مزدِ عبادت خالے
چہ دلم گشت توانگر بہ رہ آوردِ سروش
گفتم" از رنگ بہ بیرنگی اگر آرم روے
رہ دگر چوں سپرم" گفت" ز خود دیدہ بپوش"
جستم از جای و لے ہوش و خرد پیشاپیش
رفتم از خویش و لے علم و عمل دوشا دوش
تا بہ بزمے کہ بیک وقت در آنجا دیدم
بادہ پیمودن امروز و بنجول خفتن دوش
خانقاہ از روشِ زہد و ورع قلزمِ نور
بزمگاہ از اثرِ بوسہ و مے چشمۂ نوش
شاہدِ بزم در آں بزم کہ خلوت گہِ اوست
فتنہ بر خویش و بر آفاق کشودہ آغوش
ہمچو خورشید کزو ذرہ درخشاں گردد
خوردہ ساقی مے و گردیدہ جہانی مدہوش
رنگہا جستہ ز بیرنگی و دیدن نہ بچشم
رازہا گفتہ خموشی و شنیدن نہ بگوش
ہمہ محسوس بود ایزد و عالم معقول
غالبؔ این زمزمہ آواز نخواہد خاموش

نوائے ظفر

۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء

ادائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سرا
صَلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

نوائے ظفر

غزلیات

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
تیرے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جانگسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا؟ اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئنہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، برا کیا ہے؟ گر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا   کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہُوا
ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب   حمزہ کا قصہ ہُوا عشق کا چرچا نہ ہُوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل   کھیل لڑکوں کا ہُوا دیدۂ بینا نہ ہُوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا

درد منت کشِ دوا نہ ہُوا   میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟   اِک تماشا ہُوا، گِلا نہ ہُوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں   تو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب   گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟   بندگی میں مِرا بھلا نہ ہُوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما   کام گر رُک گیا، روا نہ ہُوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے   لے کے دِل دلستاں روانہ ہُوا

غالباً ذوقؔ کے شعر کی طرف اشارہ ہے ۔

• دانہ خرمن میں ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو   آئے ہے جُزو میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

مَیں اور بزمِ مے سے، یُوں تشنہ کام آؤں
گر مَیں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہُوا تھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھِدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دِل سے جگر جُدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کُشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا   بحر، اگر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دِل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے   کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعدِ یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے   کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خُدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں تو کیا ہوتا

ہُوا جب غم سے یُوں بےحِس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جُدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہُوئی مُدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یُوں ہوتا تو کیا ہوتا"

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں ۔ رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے ۔ پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کبتک؟ جاؤں انکو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

گھِستے گھِستے مِٹ جاتا آپ نے عبث بدلا   ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمّازی کر لیا ہے دُشمن کو   دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا غالبؔ دُشمن آسماں اپنا

جَور سے باز آئے، پر 'باز آئیں کیا'   کہتے ہیں، "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟   یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
مَوجِ خُوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے   آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عُمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ   مر گئے پر، دیکھیے، دِکھلائیں کیا
پُوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر   جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر؟ کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن   جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں   لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم   سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پُوجنا   چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پہ کہے بغیر

ہے بسکہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند!
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھینگے
لے آئینگے بازار سے جاکر دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں
مقدُور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لُوں
ہر اِک سے پُوچھتا ہُوں کہ جاؤں کِدھر کو مَیں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو مَیں
ہے کیا جو کَس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہُوں تمہاری کمر کو مَیں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو مَیں
چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہُوں ابھی راہبر کو مَیں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہُوں اِس بُتِ بے داد گر کو مَیں
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کُوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دِن اپنی خبر کو مَیں
اپنے پہ کر رہا ہُوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہُنر کو مَیں

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا   یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے؟   بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں   جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں   کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب   گدائے کوچۂ میخانہ نامُراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام   دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم انکے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں"

دائم پڑا ہوا ترے در پہ نہیں ہوں میں؟   خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل   انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے؟   لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب؟
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جسکے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسُوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یُوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم، کہ ویراں ہو گئیں
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟
جب وہ جمالِ دلفروز، صُورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنہ چُھپائے کیوں؟
دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
حُسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُسکی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں
ایرا ہی دیکھے ہم نے بچایا ہے کشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

گئی وہ بات، کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیونکر ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور اُنہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضورؔ
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو
قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مِرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دُشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اِک آنسو اِس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جُوئے خوں میں تیرے تَوسن کو
ہُوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بے تاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے
مَرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھکو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے؟ کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پُوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غم خوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اَے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جُرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہُوئے تم دوست جسکے دُشمن اسکا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدُو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے   بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہُوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا   مَیں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے   مدّت ہُوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضرؔ   حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پُوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟   کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صُحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں   بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

دِل آپ کا کہ دِلمیں ہے جو کچھ سب آپ کا
دِل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے   حُورانِ خُلد میں تری صُورت اگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل   میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم   ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جبقدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم   میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضرؑ کی ہم پیروی کریں   مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

کوئی دِن گر زندگانی اَور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟   سوزِ غم ہائے نہانی اَور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں   پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے
دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر   کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجُوم   وہ بلائے آسمانی اَور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صُورت نظر نہیں آتی
موت کا ایکدن معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہُوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں   میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دِل گر نظر نہیں آتا   بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے؟   آخر اس درد کی دَوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار!   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
مَیں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں   کاش پُوچھو کہ "مدعا کیا ہے؟"
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجُود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟   نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟   ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا" اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے؟
مَیں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وو آئے"
ہُوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پُوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہُوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں، اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ مِلتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے
اِس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تِری تقدیر کو رو آئے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہُوں مَیں شکوے سے یُوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے:

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یُوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تُو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدُو کیا ہے
چپک رہا ہے لہو سے بدن پہ پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفُو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشک بُو کیا ہے

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لُوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کُوزہ و سبُو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیئے کہ آرزُو کیا ہے
ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں **غالبؔ** کی آبرُو کیا ہے

مَیں انہیں چھیڑوں اور کُچھ نہ کہیں   چل نکلتے جو مَے پیئے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو ، جو کُچھ ہو   کاشکے تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اِتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
آہی جاتا وہ راہ پر **غالبؔ**
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھّا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھّا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مال اچھّا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھّا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھئے پاتے ہیں عُشاق بتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مِل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضرِ سُلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دِل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے　　ہم رہیں یُوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تُم سے کیا شِکوہ کہ یہ　　ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو　　ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم   دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا، مگر   یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر   دیکھئے کب دن پھریں حمّام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک   اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر   روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے   چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے باد پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

دیا ہے دِل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے   ہُوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بِن نہ رہے   قضا سے شکوہ ہمیں کِس قدر ہے کیا کہیے
رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب   اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
زہے کرشمہ کہ یُوں دے رکھا ہے ہمکو فریب   کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے ، کیا کہیے
تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہیے
انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے
کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی
آزمائش ہے
چمن میں خُوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسُو میں قیس و کوہکن کی
آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسفؑ کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل
تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر اچھا۔ جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
مَیں بُلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل !
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یُوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لئے یُوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پُوچھے کہ "یہ کیا ہے" تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ؟
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون؟ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردا چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو، گر برا کہے کوئی
نہ کہو، گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی
بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضرؑ نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی
جب اسکے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی   قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مرثیۂ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اَور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دِن اَور
مِٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھِسے گا
ہُوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دِن اَور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دِن اَور
جاتے ہُوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دِن اَور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دِن اَور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مِرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دِن اَور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش؟
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباری گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا!

معذرت

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپاہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ "ظفر" کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
مَیں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ اَمر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ   سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں   ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نوحہ

سید فرزند احمد بلگرامی جلوۂ خضر میں مرزا غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ 'ایک دفعہ مرثیہ کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے۔ کہ میں نے بھی ایک شروع کیا تھا۔ تین بند کہہ کر دیکھا۔ تو واسوخت ہو گیا' ۔ وہ بند یہ ہیں :۔

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو   اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسےٰ پہ فغاں ہو   اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو   ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو   گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایا جو مدّت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے؟

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا   کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا   ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے!

سلام

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اسکو   تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اسکو
نہ بادشاہ نہ سُلطاں یہ کیا ستائش ہے   کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اسکو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی   کہو کہ رہبرِ راہِ خُدا کہیں اسکو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا   اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اسکو
فروغِ جوہرِ ایماں حسینؓ ابنِ علیؓ   کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اسکو
کفیلِ بخششِ اُمت ہے، بن نہیں پڑتی   اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اسکو
مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی   ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اسکو
وہ جس کے ماتمیوں پہ ہے سلسبیل سبیل   شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اسکو!
عدُو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات   کہ جن و انس و مَلک سب بجا کہیں اسکر
بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسُین بلند   بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اسکو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرّۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اسکو
ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اسکو
ہمارا مُنہ ہے کہ دیں اسکے حُسنِ صبر کی داد
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اسکو
زمامِ ناقہ کف اسکے میں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حُسینِ علیؑ پیشوا کہیں اسکو
وہ ریگِ تفتہ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خُدا رہنما کہیں اسکو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے کے چلیں اور ناسزا کہیں اسکو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اسکو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیے گر ہم بُرا کہیں اسکو
علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حُسینؑ
کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اسکو؟
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اسکو

بھرا ہے غالبؔ دلخستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اسکو

قصیدہ

ہاں مہِ نَو سُنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص
حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

جانتا ہُوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

مَیں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہُوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اسکے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو اِنعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گُلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اِک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مَے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دُشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دور مجھکو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام
چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام
کہہ چکا مَیں تو سب کچھ اب تُو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جسکے در پہ ناصیہ سا
ہَیں مہ و مہر و زُہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مُقام

قبلۂ چشم و دلِ بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صُورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رُستم و سام
اَے ترا لطف زندگی افزا!
اَے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دُور خسروانہ شکوہ!
لوحش اللہ عارفانہ کلام!
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیزن و رہام
مرحبا مُوشگافیٔ ناوک
آفریں آبداریٔ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہُوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہُوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیٔ آغاز
ہو ابد تک رسائیٔ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کیلئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پہ کھلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
ق
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بت خانۂ آزر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِّ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا؟   کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے   یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ   دوست کا ہے حال دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ   زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں   کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ   رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک   آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ   رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہُوا مدحت طرازی کا خیال   پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے نے پائی طبیعت سے مدد   بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ   عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا   بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب عُلوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہُوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
مُلک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہُوں ہے خطِ لُوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پُوچھتا ہے کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمر و شاخ گوئے و چُوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں   آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جائے خاک   پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور   بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے   شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے   آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار   جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں   جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی   کوہکن باوجود غمگینی
جان دینے میں اسکو یکتا جان   پر وہ یُوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر   کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام   شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے   باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بہ حکمِ ربُّ الناس   بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس
یا لگا کے خضر نے شاخِ نبات   مُدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہُوا ہے ثمر فشاں یہ نخل   ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس   رنگ کا زرد پر کہاں بُو باس
آم کو دیکھتا اگر اِک بار   پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا   نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ   طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم   ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو   نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد   عدل سے اسکے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں عزِّ شان و جاہِ جلال   زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت   چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے   خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور   جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو   وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلِ شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر   اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ   فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ
کرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ اَمَر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل؟

گُذارش بحضورِ شہنشاہ

اَے شہنشاہِ آسماں اورنگ   اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا مَیں اِک بے نوائے گوشہ نشیں   تھا مَیں اِک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرُو بخشی   ہُوئی میری وہ گرمیٔ بازار
کہ ہُوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز   رُوشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از رُوئے ننگِ بے ہُنری   ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو مَیں کہوں خاکی   جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہُوں لیکن اپنے جی میں کہ ہُوں   بادشہ کا غلام کارگزار
خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح   تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شُکر   نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟   مُدعائے ضروری الاظہار
پیرِ مُرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں   ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کُچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر   تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش   جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
کُچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال   کُچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنیے
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مَدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جسکے سبب سے سرِ دست
نسبت اِک گونہ مرے دِل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دُعا شام و سحر قاضیٔ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضرؑ کی بھی مجھکو ملاقات سے ہے
اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبؔ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

قطعہ

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند
غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

قطعہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہاںتاب مبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

مُتفرّقات

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

سہل تھا مُسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزریگی اتنے روز حاضر بن ہُوئے
تین دن مُسہل سے پہلے تین دن مُسہل کے بعد
تین مُسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہُوئے

خجستہ انجمنِ طوئے میرزا جعفر   کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہُوا ہے جی محفوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ   نہ کیوں ہو مادہ سالِ عیسوی "محفوظ"
۱۸۵۴ء

ہُوئی جب میرزا جعفر کی شادی   ہُوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اسکی کیا ہے   تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲۷۰ھ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں   دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہُوئے سلام   ہے اس سے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے   تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ   ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا   اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں   ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں   عُشاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا   کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے   کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ   وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں   آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن   خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے   بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار   فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی؟   شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری؟

راز و نیاز

بر دست و پائے بندِ گرانے نہادہ   نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ
ایمن نیم زمرگ اگر رستہ ام زبند   دلدوز ناوکے بہ کمانے نہادہ

تا در اُمید عمر بہ پندار بگذرد   از لطف در حیات نشانے نہادہ
تا خستۂ بلا نبود بے گریزگاہ   در مرگ احتمالِ امانے نہادہ
رازست گر دلے بجفائے شکستہ   داد ست گر سرے بسنانے نہادہ
دوزخ بداغِ سینہ گدازے نہفتہ   قلزم بچشمِ اشک فشانے نہادہ
بر ہر دلے فسونِ نشاطے دمیدہ   بر ہر تنے سپاسِ روانے نہادہ
ہر دیدہ را درے بخیالے کشودہ   ہر فرقہ را دلے بگمانے نہادہ

غالب زغصہ مرد، ہمانا خبر نداشت
کاندر خرابہ، گنج نہانے نہادہ

نعت

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ ست   آرے، کلامِ حق بزبانِ محمدؐ ست
آئینہ دارِ پرتوِ مہر ست آفتاب   شانِ حق آشکار زشانِ محمدؐ ست
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق ست   اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ ست
دانی اگر بہ معنیٔ لَولَاک وارسی   خود ہر چہ از حق ست ازانِ محمدؐ ست
ہر کس قسم بدانچہ عزیزست میخورد   سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ ست
واعظ، حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگذار   کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ ست

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را   کاں نیمے جنبشِ زبانِ محمدؐ ست
ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود   آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ ست

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

سالکانِ طریقت

رہروان چوں گہرِ آبلہ پا بینند   پائے را پایہ فراتر ز ثریا بینند
ہرچہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند   ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند
راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند   نقشِ کج بر ورقِ شہپرِ عنقا بینند
راز زیں دیدہ وراں جوئے کہ از دیدہ وری   نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی   جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند
شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست   زخمہ کردار بہ تارِ رگِ خارا بینند
قطرہ را کہ بر آئینہ گہر خواہد بست   صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند   روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند
وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصور سنجند   مجمعِ انس بہ نے بست زلیخا بینند
ہرچہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند   ہرچہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

نستوہند اگر ہمرہِ مجنوں گردند
نخروشند اگر محملِ لیلا بینند
قشقہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند
بادہ را شمعِ طرب خانۂ ترسا بینند
برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب
خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند
دِل نہ بندند بہ نیرنگِ دریں دیرِ دو رنگ
ہرچہ بینند بعنوانِ تماشا بینند
ہرچہ در سو نتواں یافت بہ ہر سو یابند
ہرچہ در جا نتواں دید بہ ہر جا بینند
ہمہ گردند بداں پایہ کہ او را دانند
ہیچ باشند دراں وقت کہ او را بینند
بُرد از یاد کہ دُنیاست نمودِ بے بود
ایں دل افروز نمودے کہ ز دُنیا بینند

بہار

باز پیغامِ بہار آورد باد
مژدہ بہرِ روزگار آورد باد
نیکوئی در رنگ و بُو افزود بہر
تازگی در برگ و بار آورد باد
گنجِ باد آورد خسرو یک طرف
گنج ہائے بے شمار آورد باد
گر ترنج زر نباشد گو مباش
زیں نمائش ہا ہزار آورد باد
شاہدِ گل تابِ مستوری نداشت
مستش اندر رہگذار آورد باد
از ہجومِ غنچہ در صحنِ چمن
کودکانِ نے سوار آورد باد

نقشہائے دلفریب انگیخت چرخ   ابرہائے دجلہ بار آورد باد
کرد خونش گرم تاب آفتاب   چشمہا از کوہسار آورد باد
چوں سمن بشگفت گوہر در صدف   از کجا ایں کاروبار آورد باد
گر نہ لعبت باز بود ہست از چہ رُد   لالہ و گل را بکار آورد باد
گل بروئے سبزہ مے غلطد بدشت   آرزوئے سبزہ زار آورد باد
جوشِ خوں در سینہ جوشِ گل بباغ   ہم نہاں ہم آشکار آورد باد
بوئے گل شد گر بخار انگیخت خاک   موجِ گل زد گر غبار آورد باد

آئینِ مغرب

صاحبانِ انگلستاں را نگر   شیوہ و اندازِ اینان را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند   آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت   سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم ست آئیں داشتن   کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند   ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند   ایں ہنرمنداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب   دود کشتی را ہمے راند در آب

گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می بُرد
گہ دخاں گردوں بہاموں می بُرد
از دخاں زورق برفتار آمدہ
باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ
می زنند آتش بباد اندر ہمے
می درخشد باد چوں اخگر ہمے
کاروبارِ مردمِ ہشیار بیں
در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں
پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویمِ پار!

غزل

اے ذوقِ نواسنجی! بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور
گر خود نجہد از سر از دیدہ فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور
ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ
شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور
شورابۂ ایں وادی تلخ است اگر رادی
از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور
دانم کہ زرے داری ہر جا گزرے داری
مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور
گر مُغ بکدو ریزد برکف نہ و راہی شو
ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور
ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہِ چشم افگن ویں از پئے گوش آور
گاہے بسبکدستی زاں بادہ زخویشم بر
گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور
غالب کہ بقائش باد ہمپائے تو گر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئینہ پوش آور

(۱۸۵۵)

چراغِ سحری

۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

چراغِ سحری

رستخیز بیجا

بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج   ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہرِ دلی کا ذرّہ ذرّہ خاک   تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یانتک   ق   آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا   وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوے   سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم   ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب   کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا   ۱۸۵۷

فرد

روز اِس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے   کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالی ایلن براؤن الاجاہ
بلند رتبہ وہ حاکم وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جسکا طرفِ کلاہ
وہ محضِ رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسے کرے ہے جسکی نگاہ
وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جسکی پرسش کے
بنے ہے شعلۂ آتش انیسِ پرِ کاہ
زمیں سے سودہ گوہر اٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اسکے جولانگاہ
وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں الٰہی شکر!
وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے خدا کی پناہ!
یہ اسکے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش ق
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سرِ راہ
ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی دمِ روباہ
نہ آفتاب ولے آفتاب کا ہمچشم
نہ بادشاہ ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ
خدا نے اسکو دیا ایک خوبرو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ
زہے ستارۂ روشن کہ جو اسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اسکا تارِ نگاہ
خدا سے یہ ہے توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اسکا بازیگاہ
جوان ہو کے کریگا یہ وہ جہاں بانی
کہ تابع اسکے ہوں روز و شب و سپید و سیاہ
کہے گی خلق اسے داورِ سپہر شکوہ
لکھیں گے لوگ اسے خسروِ ستارہ سپاہ
عطا کریگا خداوندِ کارساز اسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملیگی اسکو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اُسے   پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ
یہ ترک تار سے برہم کریگا کشورِ روس   یہ لیگا بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ
سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون   یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہو جائیں
دراز اسکی ہو عمر اس قدر سخن کوتاہ

قصیدہ

در روزگارِ ما نتواند شمار یافت   خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکار تیز گرد فلک درمیاں مبیں   حق داد دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت
درہائے آسماں بزمیں باز کردہ اند   ہر کس ہر آنچہ جست بہرِ رہگزار یافت
آید اگر بفرض ز بالا بلا فرود   بر روئے خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
چوں حسنِ ماہِ یکشنبہ بینی بداں کہ ماہ   پاداشِ جانگدازیٔ شبہائے تار یافت
چوں روئے رنگِ گل نگری شاد شو کہ گل   اجرِ جگر خراشیٔ پیکانِ خار یافت
در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود   ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بداد گرائیش نمے کند   در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
ہر کس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت   ہر شے بہ حسنِ جوہرِ خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی بنشت   ہم بر درِ سرائے خودش بندہ وار یافت

در بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید   توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز سر گرفت   لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت
بہرامِ دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد   ناہید ذوقِ ورزشِ مضراب و تار یافت
نظّارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد   اندیشہ گنجہائے نہاں آشکار یافت
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بدہر   ہر کس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت

فیضِ سحر بہ غالبِ پیمانہ کش رسید
ذوقِ صبوح عابدِ شب زندہ دار یافت   ۱۸۵۸ء

غزلیاتِ اردو

کیونکر اس بُت سے رکھوں جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دِل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے   ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

بہت[1] سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے   غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
تمہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے   رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے   کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

---

[1] مطبوعہ دیوانوں میں اس غزل کے فقط تین اشعار ہیں۔ باقی اشعار مرزا نے ایک خط میں نقل کئے ہیں۔

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم!
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ!
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی
حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونیکے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی
سنہ ۱۲۸۲ھ

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے
ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ! ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اُٹھتے ہیں لو وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدت سے و لے آج ندیم دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
سامنا حُور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
اب ہے دلی کیطرف کُوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے دسمبر ۱۸۶۵ء

کلامِ غالبؔ (۹)

مُمکن نہیں ہے بُھول کے بھی آرمیدہ ہُوں مَیں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہُوں
ہُوں دردمندِ جبر ہو یا اختیار ہو گہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہُوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہُوا دہن از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہُوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ مَیں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہُوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ نے دانۂ فتادہ ہُوں نے دامِ چیدہ ہُوں
جو چاہتے نہیں وہ مری قدر و منزلت مَیں یوسفِ بہ قیمتِ اوّل خریدہ ہُوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ ہُوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہُوں
اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہُوں ذلیل پر عاصیوں کے زمرے میں مَیں برگزیدہ ہُوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں [1]

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ   ہُوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ
خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟   کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں بستر   ہُوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حُسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام   جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ
مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا   رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر   اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ
ہُوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب   اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ
بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہُوا   کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک   رکھو نہ شمع کے اوپر اے انجمن تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن   اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو   ہوئی ہے اس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا   کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

---

[1] یہ غزل اور اسکے بعد کی دو غزلیں بطور غیر متداول کلام کے رسالہ اُردو اور چند کتب میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن غالبؔ کی تصانیف اور مستند معاصرانہ تذکروں میں ان کے متعلق کوئی اندراج نہیں۔

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام" اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"
ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبؔ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

آپ نے مَسَّنِیَ الضُّرُّ کہا ہے تو سہی یہ بھی اے حضرتِ ایوبؑ گلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیوں سر ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بہ اُمید گزر جائے گی عمر نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری نہ سہی لیک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اُس نے نہ سہی ہم سے پر اس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ
شہرۂ تیزیٔ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہے ؟ تکلّف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے ؟ جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ ؟ کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے   یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خُدا ہے

تاریخ تذکرۂ سراپا سخن مطبوعہ سنہ ۱۲۷۷ھ

اِس کتابِ طرب نصاب نے جب   آب و تابِ انطباع کی پائی
فکرِ تاریخِ سال میں مجھ کو   ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو   دِیئے ناگاہ مجھ کو دِکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا   با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم   بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو   ہے جُدا گانہ کار فرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ   بہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم   جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ   جن سے ایماں کو ہے توانائی
انکو غالبؔ یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولّائی

سہرا

ہمنشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
اُن کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو ہے تو کشتی میں ولے بحرِ رواں ہے سہرا

قصیدہ

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس نواب مستطاب امیرِ شہ احتشام
جم رُتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام
جس بزم میں کہ ہو انہیں آئینِ میکشی واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام

قطعہ

چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چاردہ کہوں دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام
سچ ہے تم آفتاب ہو جسکے فروغ سے دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر حق کے تفضلات سے ہو مرجعِ انام
اخبار "لودھیانہ" میں میری نظر پڑی تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغِ بے نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اس بزمِ پُرفروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام
سمجھا اُسے گر اب تو ہُوا پاش پاش دِل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام
عزت پہ اہلِ نام کے ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام
آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام
اس کشمکش میں آپ کا مدّاح دردمند
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا سلام
جو واں نہ کر سکا تھا وہ لکھا حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
مُلک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں
سُلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام
وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو
شاہانِ عصر چاہیئے لیں عزت اس سے وام
خود ہے تدارک اسکا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام
امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہیئے قیام
ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضورؐ تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے یعنی دُعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام
ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے اقلیم ہند و سند سے تا مُلک رُوم و شام

دُعا

اے جہاں آفریں خدائے کریم صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادمان رہے اور غالبؔ پہ مہربان رہے

قطعہ[1]

مقامِ شکر ہے اَے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیٔ مہ وش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بیار، لا مئے گلنار گوں، ببار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پہ اے ابر بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
امیرِ کلب علی خاں جئیں ہزار برس

---

[1] مکاتیبِ غالبؔ

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

قطعہ مدحیہ[1]

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

[1] مکاتیبِ غالب

رام پور ایک بڑا باغ ہے ازروئے مثال
دل کش و تازہ و شاداب و وسیع و خُرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلب علی خاں سے مُدام
دُرِّ شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آجائے جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گُل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حَبَّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آجائے تو لے اُن کے قدم
مَدح کے بعد دُعا چاہیئے اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراق رقم
حق سے کیا مانگیے ؟ ان کے لئے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غُلو کے قائل
وہ دُعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا! غالبؔ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

قطعہ

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے   پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم   کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں   نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں   ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول   وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اسکو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

رُباعیات

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے   ثاقبؔ! حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب   غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں   کٹتا ہے بتاؤ کسی طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک   سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

قصیدہ

مرحبا سالِ فرخی آئیں   عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب روز افتخارِ لیل و نہار   مہ و سال اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نو روز   لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی   جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بکو عبیر و گلال   باغ میں سو بسو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار   باغ گویا نگارخانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب   جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں   منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب   رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں امیرِ شاہ نشاں   رزم گہ میں حریفِ شیر کمیں
پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ   خیر خواہِ جنابِ دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ   جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے   آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور   نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
انجم چرخ گوہر آگیں فرش   نور لے ماہ ساغرِ سیمیں
راجہ اِندر کا جو اکھاڑا ہے   ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال   یہ ضیا بخش چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم   کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے   ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا!   جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون   یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت بیں
سرورِ دہر فر ہوا جو سوار   بہ کمالِ تجمل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن   اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقش سمِ سمند سے یکسر   بن گیا دشت دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ مشک فشاں   راہ رووں کے مشام عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت   فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا   جس طرح ہو سپہر پہ پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام   ران پر داغِ تازہ دیکھے وہیں

اور داغ آپ کی غُلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سُرین
بندہ پرور ثنا طرازی سے
مُدّعا عرضِ فنِّ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا مُنہ
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی اِ خُدا کی پناہ
دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
حرفِ اظہار ہے ارادت کا
ہے قلم کو جو سجدہ ریزِ زمیں
مدح گستر نہیں دُعا گو ہے
غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دُعا بھی یہی کہ دُنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں آمیں!

جنوری ۱۸۶۵ء

قطعہ

خواندی بہ نو بہار مرا جانبِ چمن
زیں برگ ہائے سبز چہ گرد آورم نوا
گفتی گُل است کے زرِ گُل را تواں فروخت
گفتی ہوا است، گنج نمی بارد از ہوا
گفتی مے است، مے نکند جوع را علاج
گفتی غنا غنی نتواں شُد بدیں غنا
گفتی بتانِ سیمتن و گوہریں پرند
طاؤس وار جلوہ طرازند جا بجا
آں لوے و موے و سینہ و ساعد ازاں تو
پیرایہ ہر چہ از گہر و زر بود مرا

غزلیاتِ فارسی

ہم انا اللہ خواں درختے را بگفتار آورد
ہم انا الحق گوئے مردے را بسرِ دار آورد

ایکہ پنداری کہ ناچار است گردوں در روش
نیست ناچار آنکہ گردوں را برفتار آورد

نکتہ داریم و بایاراں نمے گوئیم فاش
طالبِ دیدار باید تابِ دیدار آورد

آں کند قطعِ بیاباں، ایں شگافد مغزِ کوہ
عشق ہر یک را بطرزِ خاص در کار آورد

جذبِ شوقش بیں کہ در ہنگام برگشتن ز دیر
در قفائے خویشتن بت را برفتار آورد

دانہا چوں ریزد از تسبیح، تارے بیش نیست
ایں مشعبد دہر گاہ از سبحہ زنار آورد

نزدِ ما حیف است گو نزدِ زلیخا میل باش
جذبہ کز چاہ یوسف را ببازار آورد

ہر انارے را کہ افشاریم ازوے خوں چکد
ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد
نیست چوں در منطقش جز ذکر شاہد حرف و صوت
شاہدے باید کہ غالبؔ را بگفتار آورد (۱۸۶۵ء)

از جسم بجاں نقاب تا کے   ایں گنج دریں خراب تا کے
ایں گوہرِ پر فروغ یا رب   آلودۂ خاک و آب تا کے
ایں راہ روِ مسالکِ قدس   واماندۂ خورد و خواب تا کے
بیتابیٔ برق جز دمے نیست   ما ویں ہمہ اضطراب تا کے
جاں در طلبِ نجات تا چند   دِل در تعبِ عتاب تا کے
پرسش ز تو بے حساب باید   غمہائے مرا حساب تا کے
غالبؔ بچنیں کشاکش اندر
یا حضرتِ بوتراب تا کے!

رباعی

خواندیم سخنہائے محبت بسیار   راندیم سخنہائے محبت بسیار
رفتیم آخر ز عالم و در عالم   ماندیم سخنہائے محبت بسیار

خاتمہ

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام بابو گوپال داس مینیجر چھپا اور شیخ محمود احمد نظامی پبلشر نے لاہور سے شائع کیا